ماہنامہ

# جہدِ حق

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

HRCP

جلد نمبر 25......شمارہ نمبر 04 ...... اپریل 2018

Monthly JEHD-E-HAQ - April-2018 - Registered No. CPL-13

زندہ رہتے ہیں، ہر پل، ہر سُو ...... کچھ لوگ مرا نہیں کرتے

05 مارچ 2018، اسلام آباد: ایچ آر سی پی نے انسانی حقوق کی نامور کارکن عاصمہ جہانگیر کی یاد میں تعزیتی ریفرنس کا اہتمام کیا

11 مارچ 2018، کراچی: عاصمہ جہانگیر کی انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کو سلام پیش کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کی گئی

# فہرست


| | |
|---|---|
| عاصمہ جہانگیر کی یاد میں | 3 |
| عاصمہ جہانگیر: ہم ان کی زندگی کا جشن منائیں گے | 5 |
| دھمکیوں سے خوفزدہ ہوئیں نہ ہم پر ڈر اور خوف حاوی ہونے دیا | 6 |
| عاصمہ: تم جاوداں ہو اور کامران بھی | 8 |
| عاصمہ جہانگیر ایک بہادر عورت | 9 |
| عاصمہ جہانگیر: پیچھے نہیں ہٹنا، آواز اٹھانی ہے | 10 |
| محروم معاشرے کا اثاثہ | 11 |
| عاصمہ کی مشعل کون اٹھائے گا | 12 |
| امید کی وراثت | 13 |
| یہ مزاحمت ختم نہیں ہوگی | 14 |
| عاصمہ جہانگیر ایک ہمہ گیر شخصیت | 15 |
| انسانی حقوق کی نگہبان۔ عاصمہ جہانگیر | 16 |
| عاصمہ جہانگیر: بس یادیں رہ جاتی ہیں | 17 |
| عاصمہ۔۔۔انتہائی دلیر خاتون | 18 |
| روشن خیالی کی پسپائی اور حکمراں طبقے کا کردار | 19 |
| عاصمہ جہانگیر، کہاں سے لائیں تجھ سا کہیں جسے | 20 |
| The last word | 22 |
| The legacy Asma leaves behind | 23 |
| Goodbye, warrior! | 26 |
| Asma Jahangir is no more - but her formidable legacy lives on | 28 |
| My rock star khala | 31 |
| Civil society after Asma | 32 |
| Who's afraid of Asma Jahangir? | 34 |
| Asma Jahangir, my fearless friend | 35 |
| My friend Asma | 38 |


# عاصمہ جہانگیر کی یاد میں

عاصمہ جہانگیر کی شخصیت کا بنیادی خاصہ یہ تھا کہ وہ ایسے وقت میں آواز بلند کرتی تھیں جب بہت سے لوگ خوف کے مارے چُپ ہو جاتے تھے۔ میری پیشگی معذرت قبول کر لیں کیونکہ کسی بھی تقریر میں اُن کی جدوجہد کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔

عاصمہ جہانگیر بچپن سے ہی جبر اور امتیازی سلوک کے خلاف صف آراء تھیں، اور 'ننھی ہیروئن' کے نام سے پکاری جانے والی لڑکی بڑا ہو کر انسانی حقوق کی سرگرم کارکن بنی اور اس دنیا کو بہتر مقام بنانے کے لیے جدوجہد کا عملی نمونہ ثابت ہوئی۔

عاصمہ نے تمام افراد کے انسانی حقوق کو قانونی تحفظ دینے کے جذبے سے سرشار ہوتے ہوئے، اپنی بہن اور دیگر کارکنوں کے ساتھ مل کر ایک لاء فرم قائم کی جو کہ پاکستان میں عورتوں کی جانب سے بنائی گئی پہلی لاء فرم تھی۔ عاصمہ معاشرے کے سب سے زیادہ غیر محفوظ و پسماندہ طبقوں اور خواتین، اقلیتوں اور بچوں کے حقوق جو عاصمہ کے نزدیک انتہائی اہمیت کے حامل تھے، کا دفاع کرتی رہیں۔ اپنی عالمی ذمہ داریوں میں مشغول ہونے سے پہلے، وہ ایک طویل عرصہ تک سول سوسائٹی کی کارکن کی حیثیت سے کام کرتی رہیں، اور انہوں نے کئی این جی اوز کی بنیاد رکھی، ان تنظیموں کی انتظامی کونسل اور جنرل کونسل کا رکن رہیں۔ ان تمام ذمہ داریوں کے دوران انہوں نے صرف ایک ہی اصول کو سامنے رکھا: ہمارے ہر کام کا مقصد ان لوگوں کا مفاد ہونا چاہیے جن کے حقوق پامال ہو رہے ہیں۔

مذہب کی تضحیک کے معاملات سے باخبر ہونے اور لسانی و مذہبی اقلیتوں کے حقوق کے متعلق حساس ہونے کے باعث انہیں 2004ء میں مذہب و عقیدے کی آزادی پر خصوصی رپورٹیئر بنایا گیا جس کے نتیجے میں ان کے کام اور آواز کو عالمی پذیرائی ملی۔ ان میں حکومتوں سے سیاسی لحاظ سے حساس قومی معاملات پر کام کروانے کی صلاحیت بھی تھی۔ انہوں نے دنیا بھر میں بڑھتی ہوئی مذہبی عدم برداشت اور مذہب کی بنیاد پر جرائم سرزد کرنے والوں کو کھلی چھوٹ کی شدید مذمت کی۔ گزشتہ برس امریتا سین لیکچر کے دوران انہوں نے کہا کہ ''مذہب کی بنیاد پر قانون سازی کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح کرنے سے قانون خود استحصال کا آلہ بن جاتا ہے''۔

انسانی حقوق، سول سوسائٹی کی تنظیموں اور اقوام متحدہ کی ثابت قدم حامی ہونے کی بدولت، انہیں بعد میں ایران میں انسانی حقوق کی خصوصی رپورٹیئر بنایا گیا۔ ان کی زندگی کی داستان اپنے آبائی ملک میں خواتین و اقلیتوں کو انصاف دلانے کی جدوجہد سے پہلے ہی رَقم تھی مگر اس کے باوجود انہوں نے یہ اضافی ذمہ داری بھی انتہائی پُروقار اور عقلمندانہ انداز سے نبھائی۔ ایرانی حکومت نے انہیں اپنی تفویض کردہ ذمہ داری نبھانے سے روکنے کے لیے ان کے خلاف بے بنیاد الزامات کی مہمیں چلائیں اور ان کے لیے کئی مشکلات پیدا کیں مگر یہ تمام ہتھکنڈے انہیں انتہائی اہم معاملات پر کام کرنے سے نہ روک سکے۔ گزشتہ ہفتے کونسل برائے انسانی حقوق کے اجلاس میں ایران میں نسانی حقوق کی صورتحال پر جو بحث ہوئی اور ایرانی وفد کے ساتھ ملاقاتوں و مشاورتوں کے جو پروگرام طے ہوئے، یہ سب پیش رفتیں ایرانی شہریوں کی زندگی میں بہتری لانے کے لیے عاصمہ کے بے مثال کردار کی عکاسی کرتی ہیں۔ اگرچہ انہیں ایران میں کام کرنے کا بہت مختصر وقت ملا یہ مختصر مینڈیٹ بھی ایران میں انسانی حقوق کے محافظین کو عاصمہ کے کام اور طاقت کے حجم سے روشناس کرانے کے لیے کافی تھا۔

انہوں نے ایک مرتبہ بی بی سی کے رپورٹر کو انٹرویو میں بتایا کہ: ''ایک وقت تھا جب میں خوفزدہ ہو گئی تھی، ایک وقت تھا جب میں چلائی تھی۔۔لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ وحشیانہ پن کے آگے ہتھیار ڈال دیں؟ نہیں، کبھی نہیں۔''

یہ امر درحقیقت انسانیت اور ایک ایسی خاتون کی ثابت قدمی کو ظاہر کرتا ہے جو مشکل ترین حالات میں طاقت اور ناانصافی کے آگے ڈٹ گئی تھی۔

انسانی حقوق کے حامی کے طور پر عاصمہ کی زندگی کئی معنوں میں دنیا کے کسی بھی کونے میں رہنے والے باہمت محافظین کی عکاسی کرتی ہے۔ انہیں کامیابیاں بھی ملیں اور ناکامیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، لیکن انہوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ انہیں گھر پر نظربند رکھا گیا، انہیں جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئیں، اور انہیں نفرت انگیز مہمات کے ذریعے بدنام کیا گیا، لیکن انہوں نے کبھی ہتھیار نہ ڈالے۔ انہوں نے اس بات کا عملی مظاہرہ کر کے دکھایا کہ انسانی وقار کے تحفظ.....غیر محفوظ ترین لوگوں کے لیے آواز اٹھانے سے لے کر اقوام متحدہ کی رکن کے طور پر بین الاقوامی قانون کے تحفظ تک.....کن مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔

وہ کئی محاذوں جیسے کہ خواتین کے حقوق، پاکستان میں اور دیگر ممالک میں مذہبی و لسانی اقلیتوں کے حقوق، باضابطہ قانونی کارروائی کے حق کے احترام اور شفاف ٹرائل، سزائے موت کے خاتمے، اور غیر جمہوری حکمرانی کی مزاحمت پر صف آراء

رہیں۔ جب 90 کی دہائی میں انہیں جج بننے کی پیشکش کی گئی تو انہوں نے جواب دیا: ''جج بننا اور ایک ایسے قانون کا دفاع کرنا جس پر میں یقین نہیں رکھتی منافقت کے مترادف ہوگا''۔ وہ پاکستان میں ساری زندگی، ایران میں گزشتہ چند سالوں کے دوران اور دنیا بھر میں گزشتہ دہائیوں کے دوران تمام لوگوں کے انسانی حقوق، آزادی اور وقار کی ایک پرجوش حامی رہیں۔

ہم میں سے جو انہیں جانتے ہیں، وہ اس بات سے واقف ہیں کہ وہ صاف گو تھیں، بااصول تھیں، پرجوش تھیں، نہایت باہمت تھیں اور وہ اپنے اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتی تھیں۔ پاکستان میں ایسی خاتون کا ہونا ہر پاکستانی کے لیے باعثِ فخر ہے۔ اور یہ انسانی حقوق کی برادری کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے لیے ایک رہنما شخصیت موجود ہے۔ ان کی وفات ایک بہت بڑا نقصان ہے، اور ہم میں سے وہ تمام لوگ جو انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کرتے ہیں انہیں آنے والی کئی دہائیوں تک ان کی قوت، رہنمائی اور حوصلے کی ضرورت رہے گی۔ وہ ہم سب اور انسانی حقوق کے محافظین کی نوجوان نسل کے لیے رہنمائی کا ذریعہ، اور اس مشترکہ جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے توانائی کا ذریعہ رہیں گی جس کے لیے انہوں نے نہایت فراخدلی سے اپنا کردار ادا کیا۔

درج ذیل سول سوسائٹی تنظیموں کے ایماء پر

مینن کرائٹس، ایف آئی ڈی ایچ کا مشترکہ بیان

آرٹیکل 19
بہائی انٹرنیشنل کمیونٹی
سنٹر فار ری پروڈکٹیو رائٹس
سویکس
ڈیفنس فار چلڈرن انٹرنیشنل
ڈیفنڈ ڈیفنڈرز
عالمی وفاق برائے انسانی حقوق (ایف آئی ڈی ایچ)
فورم۔ایشیا
فرانسسکنز انٹرنیشنل
پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی)
ہیومن رائٹس واچ (ایچ آر ڈبلیو)
عالمی کمیشن برائے ماہرین قانون (آئی سی جے)
انٹرنیشنل کرائسز گروپ
عالمی یونین برائے انسانیت واخلاقیات (آئی ایچ ای یو)
ہر قسم کے امتیازی سلوک اور نسلی تعصب کے خلاف بین الاقوامی تحریک (آئی ایم اے ڈی آر)
بین الاقوامی سروس برائے انسانی حقوق (آئی ایس ایچ آر)
امپیکٹ ایران
اقلیتوں کے حقوق کا گروپ
رائٹ لائیولی ہڈ ایوارڈ فاؤنڈیشن
عالمی حقوق کا گروپ (یو آر جی)
عالمی خواتین لیگ برائے امن وآزادی (ڈبلیو آئی ایل پی ایف)
ایذارسانی کے خلاف عالمی تنظیم (او ایم سی ٹی)

[پریس ریلیز۔لاہور۔19 مارچ 2018]

## ایچ آر سی پی اپنی بانی عاصمہ جہانگیر کی موت پر شدید غمزدہ ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) عاصمہ جہانگیر کی غیر متوقع اور اچانک وفات پر شدید غم اور صدمے سے دوچار ہے۔ عاصمہ جہانگیر نہ صرف ایچ آر سی پی کے بانیوں میں شامل تھیں بلکہ وہ ایک مثالی وکیل، انسانی حقوق کی نامور علمبردار، جمہوریت کی زبردست حامی، دوست، عظیم استاد اور غریب اور محروم طبقات کی ایک بہادر ساتھی بھی تھیں۔ وہ گزشتہ روز دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کرگئیں۔

عاصمہ جہانگیر نے پاکستان میں انسانی حقوق کی تحریک کی بنیاد ڈالی اور اُسے ایک واضح پہچان دی۔ انہوں نے پاکستان کے تمام لوگوں کے حقوق کے تحفظ اور جمہوری نظام کی ترقی کی جدوجہد کو آواز دینے کے لیے اپنے چند دیگر ساتھیوں کے ساتھ مل کر 1986ء میں ایچ آر سی پی کی بنیاد ڈالی۔ تاہم، ایچ آر سی کو ملکی وعالمی سطح پر اہمیت اور رسائی ملنے کی خاص وجہ وہ ہی تھیں۔ عاصمہ جہانگیر ماضی میں ایچ آر سی پی کے سیکرٹری جنرل اور چیئرپرسن کے عہدوں پر براجمان رہیں۔ اِس وقت وہ دیگر کئی اہم خدمات سرانجام دینے کے علاوہ، ایچ آر سی پی کے ترجمان اور ایران میں اقوام متحدہ کے خصوصی رپورٹیئر برائے انسانی حقوق کے طور پر کام کر رہی تھیں۔

انسانی حقوق کی تحریک کے لیے عاصمہ جہانگیر کی بے مثال اور نمایاں خدمات کا اعتراف ملکی وعالمی سطح پر ان کے دوستوں ودشمنوں، دونوں نے کیا ہے۔ ایچ آر سی پی انسانی حقوق کے ایسے کسی کارکن کو نہیں جانتا جو عاصمہ جہانگیر سے زیادہ بہادر اور انتھک ہو۔ وہ ان تمام لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گی جن کی زندگیوں پر وہ اپنا نقش چھوڑ گئی ہیں۔

[پریس ریلیز۔لاہور۔12 فروری 2018]

## جہدحق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا۔ جوخامیاں/ کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔
- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ/اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کرکے بذریعہ ڈاک روانہ کرسکتے ہیں۔ حقائق اچھی طرح سے تصدیق کرکے لکھیں۔

## HRCP کارکن متوجہ ہوں

'''جہدحق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پرمبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتے تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تاکہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جاسکے۔

**جہدحق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ پتہ:**

www.hrcp-web.org

**پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق**

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

# عاصمہ جہانگیر: 'ہم ان کی زندگی کا جشن منائیں گے'

ریاض سہیل
بی بی سی اردو ڈاٹ کام، کراچی

پاکستان میں حقوقِ انسانی کے لیے بلند ہونے والی ایک بہت بڑی آواز اتوار کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔

عاصمہ جہانگیر کی موت کی خبر سامنے آنے پر کراچی میں کتب میلے کا سماں اتوار کی دوپہر سوگوار ہوگیا، سٹیج ہو یا راہدری میں بیٹھے ہوئے لوگ، سب کا موضوع اور حوالہ عاصمہ جہانگیر اور ان کی جدوجہد ہی رہا۔

پاکستان اور انڈیا میں امن کی کوششوں پر ابھی پروگرام کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا، پروفیسر خالدہ غوث انڈیا کے سابق وزیر منی شنکر ائیر اور پاکستان کے سابق سفیر جہانگیر اشرف قاضی کا تعارف کروا رہی تھیں کہ ایک خاتون نڈھال حالت میں سٹیج پر گئیں اور افسردہ لہجے میں آگاہ کیا کہ ہماری دوست عاصمہ جہانگیر کا انتقال ہوگیا ہے۔

یہ خاتون کشور ناہید تھیں، ان کے یہ الفاظ سننے کے بعد پورے ہال میں خاموشی چھا گئی۔ پروفیسر خالدہ غوث نے عاصمہ کو خراج تحسین پیش کیا اور پروگرام کو آگے بڑھایا۔

کراچی کتب میلے کی اختتامی تقریب کو عاصمہ جہانگیر کے نام سے منسوب کیا گیا، اس دوران شرکا نے ایک منٹ کی خاموشی بھی اختیار کی۔

انسانی حقوق کے سینیئر رکن اور عاصمہ جہانگیر کے ساتھی آئی اے رحمان نے تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس کمیشن کے لیے بہت سے لوگوں نے کام کیا ہے۔

'ہماری یہ خوش قسمتی تھی کہ ہمیں اس کی سربراہی کے لیے جسٹس دراب پٹیل جیسے بے مثال انسان کی سرپرستی حاصل تھی لیکن حقیقت یہ ہے ہیومن رائٹس کمیشن کو بنانے میں جتنا کردار اور حصہ عاصمہ جہانگیر کا تھا اتنا دور دور تک کسی اور کا نہیں ہوسکتا۔'

آئی اے رحمان نے بتایا کہ آگرہ میں پاکستان اور انڈیا کانفرنس کے موقع پر عاصمہ بھی وہیں موجود تھیں اور پاکستان کے اس وقت کے صدر پرویز مشرف بھی تھے۔ پرویز مشرف طیش میں آئے کہنے لگے میرا جی چاہتا ہے کہ میں طمانچہ ماردوں۔

'عاصمہ جہانگیر کو یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ وہ بڑے سے بڑے ڈکٹیٹر کو خوف زدہ کر دیتی تھیں، جنرل مشرف نے کئی بار کوشش کی کہ وہ ان کی بات مانیں اور آخر میں تو یہ بھی کہا کہ میرا مقدمہ آپ لڑیں تو انھوں نے کہا کہ میں اپنے اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتی۔'

آئی اے رحمان نے عاصمہ جہانگیر کی نواب اکبر بگٹی کے آخری ایام میں ملاقات کا حوالہ دیا اور بتایا کہ عاصمہ نواب بگٹی سے ملنے جا رہی تھی کہ ان کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی، بعض حلقوں نے سوچا کہ وہ آگے نہیں جائیں گی لیکن عاصمہ نے کہا

کہ آپ کی گولیاں ختم ہو جائیں گی لیکن میرا سفر ختم نہیں ہوگا۔

'جب وہ سندھ آتی تھیں اور مٹھی، خیر پور اور نوشہرو فیروز جاتی تھیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ یہاں کی ہی رہنے والی ہیں۔ وہاں کی خواتین، بچے اور انسانی حقوق کے کارکن ان سے ایسے ملتے تھے جیسے ان کی کھوئی ہوئی بہن آ گئی ہے۔'

انھوں نے کہا کہ عاصمہ جہانگیر نے کبھی کوئی بات ادھار

نہیں رکھی جو بات کی وہ اسی وقت کی۔ 'جب ہم برسلز گئے اور انھیں ایوارڈ ملا تو انھوں نے کہا کہ میرے ساتھ انسانی حقوق کمیشن کو بھی ایوارڈ دیں، اس بہانے انھوں نے انعام کی ساری کی ساری رقم انسانی حقوق کمیشن کو دے دی۔ ہم ان کی موت پر بہت زیادہ نہیں روئیں گے بلکہ ان کی زندگی کا جشن منائیں گے۔

ویمن ایکشن فورم کی رہنما انیس ہارون کا کہنا تھا کہ نامور شاعر حبیب جالب نے بینظیر بھٹو کے لیے کہا تھا ڈرتے ہیں بندوقوں والے ایک نہتی لڑکی سے۔ یہ بات عاصمہ پر بھی صادق آتی ہے، وہ ایک دیرینہ دوست اور رفیق تھیں۔

'عاصمہ کی آواز ہمیشہ حق کے لیے اٹھی، خواتین کے لیے اٹھی، اس ملک کے پسماندہ لوگوں کے لیے اٹھی، میں یہ نہیں کہتی کہ وہ آواز بند ہوگئی جو چراغ عاصمہ نے ہزاروں دلوں میں جلائے ہیں وہ ہمیشہ جلتے رہیں گے، وہ سیکیولر، جمہوری اور فلاحی ریاست کے لیے کوشاں تھیں ان کا یہ مشن ہمارے ساتھ رہے گا۔'

نامور شاعرہ کشور ناہید کا کہنا تھا کہ یہ دو سال پہلے کی بات ہے جب عاصمہ کو امن کا عالمی ایوارڈ ملا اور لاہور میں اس موقعے کو منانے کا فیصلہ کیا گیا، عاصمہ نے انھیں کہا کہ آپ بھی اسلام آباد سے لاہور آ جائیں۔

کشور ناہید نے ایک نظم لکھی جو انھوں نے پڑھ کر عاصمہ کو خراج تحسین پیش کیا۔

دنیا سوچتی تھی اور حیران ہوتی تھی
کیا کبھی دانتری سے گھاس کاٹتی عورت
آسمان میں ستارہ بن کر چمکے گی
کیا یہ بھی ہوگا کہ انگوٹھا لگا کر اپنا حق دے دینے والی عورت
دنیا کے سامنے اپنا حق مانگے گی
وہ منھاری سی عورت عاصمہ جہانگیر
جس نے حکمرانوں کو للکارا ہو
جس کی ایک آواز پر باندی بنی عورتیں ہوں
یا اینٹوں کے بھٹوں پر غلام در غلام خاندان ہوں
ایسے کھچے چلے آئیں ایسے رقص کرتی ہوئی ہوا
جیسے جھومتی ٹہنیاں جیسی خوشبو پھیلاتی بہار
وہ صلیب سے بھی انصاف کے ترازو کو اتروا لیتی تھی
زمین پر راج کرتے ہوئے خداؤں کو للکارتی
بیڑیوں کو پازیبوں میں بدل دیتی
تعزیز سیاست کے پردے چاک کرتی
وعظوں اور فتویٰ فروشوں کو بے نقاب کرتی
خزاں زدہ چہروں کو بہاریں پہناتی

(12 فروری، 2018)

(بی بی سی اردو)

# دھمکیوں سے خوفزدہ ہوئیں نہ ہم پر ڈر اور خوف حاوی ہونے دیا

عنبرین فاطمہ

## عاصمہ جہانگیر کی بیٹیوں منیزے جہانگیر اور سلیما جہانگیر سے خصوصی انٹرویو

''عاصمہ جہانگیر'' کی شخصیت اپنے چاہنے والوں میں جہاں ہمیشہ ایک عمدہ مثال رہے گی وہیں ان کے اہل خانہ کے لیے ان سے وابستہ لمحے کبھی فراموش نہ کئے جاسکیں گے اور بچوں کے لیے ماں کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ تو واقعی کبھی بھلایا نہ جاسکے گا۔ عاصمہ کی دونوں بیٹیوں کا کہنا ہے کہ ہماری والدہ بہت ہی مضبوط اعصاب کی مالک تھیں ان کو کبھی روتے نہ دیکھا لیکن جب بےنظیر بھٹو کا قتل ہوا اس وقت وہ روئیں اور کافی دن تک اپنے کمرے میں بند رہیں۔ کہا کرتی تھیں اس ملک میں بے آسرا بچوں کی نمائندگی کرنے والا کوئی نہیں ان کی تو کوئی ضمانت تک نہیں دیتا۔ جب کبھی ہم نے اپنی والدہ سے کہا کہ امی آپ کے خلاف کسی اینکر پرسن نے اپنے پروگرام میں فلاں بات کی ہے تو کہا کرتی تھیں کہ میں ان کو جواب کیوں دوں لہذا تم لوگ بھی نظرانداز کردیا کرو۔ ہماری ماں اپنے بچوں کو کبھی نہ بتاتی تھیں کہ ان کو جان سے مارنے کی دھمکیاں مل رہی ہیں۔ مشترکہ خاندانی نظام میں رہیں اور پورے خاندان کو جوڑ کر رکھنے میں پل کا کردار ادا کیا۔ شادی کے بعد وکالت کی تعلیم حاصل کی اور پہلی گاڑی 22,000 کی لی جس میں اے سی تو دور کی بات، جگہ جگہ گاڑی بند ہوجاتی تھی ہم سب بہن بھائی دھکا لگا کر چلاتے۔ گزشتہ دنوں ہم نے عاصمہ جہانگیر (مرحومہ) کی بیٹیوں منیزے جہانگیر اور سلیما جہانگیر سے نوائے وقت کے لیے انٹرویو کیا۔ اس میں ہونے والی باتیں کچھ یوں ہیں۔ سلیما جہانگیر منیزے سے چھوٹی ہیں اور وکیل ہیں لندن میں ایک لاءفرم میں کام کرتی رہی ہیں والدہ کی وفات کے بعد آج کل ان کے تمام معاملات کو دیکھ رہی ہیں۔ انہوں نے ہم سے بات کرتے ہوئے کہا کہ جس اتوار کو امی کا انتقال ہوا اس سے پچھلے ہفتے وہ لندن آئیں تھیں انہیں بےنظیر بھٹو پر آکسفورڈ یونیورسٹی میں لیکچر دینا تھا لیکچر کے بعد وہ بہت ہی خوش تھیں ان کا کہنا تھا کہ جو بےنظیر کو جانتے ہیں ان کو ضرورت نہیں کہ وہ بی بی پر بات کرنے کے لئے تیاری کریں۔ منگل کے روز وہ مجھ سے مل کر ڈھیر ساری باتیں کرکے واپس پاکستان کے لیے روانہ ہوئیں، میری بیٹی کی چونکہ سکول سے چھٹیاں تھیں اس لیے میں امریکہ چلی گئی ابھی پہنچی ہی تھی کہ میری بہن کا فون آیا کہ امی کا انتقال ہوگیا ہے بس میں فوراً پاکستان آ گئی۔

سلیما جہانگیر منیزے سے چھوٹی ہیں اور وکیل ہیں لندن میں ایک لاءفرم میں کام کرتی رہی ہیں والدہ کی وفات کے بعد آج کل ان کے تمام معاملات کو دیکھ رہی ہیں۔ انہوں نے ہم سے بات کرتے ہوئے کہا کہ جس اتوار کو امی کا انتقال ہوا اس سے پچھلے ہفتے وہ لندن آئیں تھیں انہیں بےنظیر بھٹو پر آکسفورڈ یونیورسٹی میں لیکچر دینا تھا لیکچر کے بعد وہ بہت ہی خوش تھیں ان کا کہنا تھا کہ جو بےنظیر کو جانتے ہیں ان کو ضرورت نہیں کہ وہ بی بی پر بات کرنے کے لئے تیاری کریں۔ منگل کے روز وہ مجھ سے مل کر ڈھیر ساری باتیں کرکے واپس پاکستان کے لیے روانہ ہوئیں، میری بیٹی کی چونکہ سکول سے چھٹیاں تھیں اس لیے میں امریکہ چلی گئی ابھی پہنچی ہی تھی کہ میری بہن کا فون آیا کہ امی کا انتقال ہوگیا ہے بس میں فوراً پاکستان آ گئی۔

تاثر ہے کہ گھریلو معاملات کو اچھی طرح نہیں دیکھ پاتیں۔ ہماری والدہ کے بارے میں بھی بہت سارے لوگوں کا کہنا تھا کہ شاید یہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے اپنے بچوں کو وقت نہیں دے پاتیں لیکن ہماری ماں جتنی کامیاب اپنے کیریئر میں تھیں اس سے کہیں زیادہ کامیاب وہ بطور ماں، بطور بیوی اور بہو تھیں۔ میری کوشش ہے کہ اپنی والدہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے مشن کو جاری رکھوں۔ منیزے جہانگیر عاصمہ جہانگیر کی بڑی بیٹی ہیں ان سے جب ہم نے بات کو تو ان کی آنکھیں تو تین بار نم ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میری والدہ کی شادی چونکہ بہت ہی کم عمر میں ہوئی تھیں لہذا اپنی پڑھائی مکمل نہیں کرپائی تھیں۔ میری پیدائش کے بعد انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ میں نے تو اپنی ماں کو اس سوسائٹی کی فرسودہ رسم ورواج، تنگ نظری اور ظلم کے خلاف لڑتے دیکھا۔ انہوں نے جس طرح ضیاء الحق کے زمانے میں ''عورت کی آدھی گواہی'' کو لے کر جلوس نکالا وہ آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ اسی چکر میں میری والدہ کو پولیس نے گرفتار بھی کیا۔ گرفتاری کے بعد انہیں جیل میں رہنا پڑا۔ ہمیں لوگوں نے کہا کہ آپ کی والدہ تو جیل میں ہیں تو ہم بہت پریشان ہوئے۔ میں اس وقت بہت چھوٹی تھیں امی جب آئیں تو میں نے کہا کہ امی آپ جیل میں رہ کر آئیں ہیں لوگ باتیں کر رہے ہیں تو انہوں نے مجھے اور میری بہن کو بہلانے کے لیے کہا کہ جیل میں ہم سب نے بہت مزہ کیا، گانے گائے، کیک کھائے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ مال روڈ کے جلوس کی ایک یاد یہ بھی ہے میری والدہ، حبیب جالب، بشریٰ اعتزاز، مہاراج غلام حسین کتھک جو کہ مجھے ڈانس بھی سکھاتے تھے یہ سب اکٹھے تھے۔ انہوں نے پلان بنا رکھا تھا کہ اگر پولیس آ گئی تو ہم نے کہاں سے اور کیسے بھاگنا ہے لیکن پولیس نے ان کو چاروں طرف سے گھر لیا۔ میں، میری بہن اور ہماری ملازمہ سائیڈ پر کھڑی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ میری گود میں میرا چند ماہ کا بھائی تھی، ایک دم پولیس نے آنسو گیس پھینکنی شروع کردی۔ ہماری ملازمہ نے گاڑی کا شیشہ اوپر کرنے کی کوشش کی لیکن میری آنکھوں میں آنسو گیس پڑ گئی وہ پہلی بار تھا جب آنسو گیس کا شکار ہوئی۔ خیر میری امی کو کوٹ لکھپت جیل لے جایا گیا کہا جارہا تھا کہ انہیں ایک ایسی مثال بنایا جائے گا کہ دنیا دیکھے گی۔ ان کا کورٹ مارشل کیا جائے گا وہ بین الاقوامی میڈیا جو افغان جنگ کی وجہ سے ضیاء الحق کے گن گا رہا تھا وہی اس کے خلاف لکھنا شروع ہوگیا بلکہ Ugly Face of Zia Ul Haq کے نام سے ایک آرٹیکل بھی چھپا۔ میری والدہ دو ہفتوں تک جیل میں رہیں مجھے یاد ہے کہ میں بڑی تھی میں اور میری بہن تیار ہوکر کھانا لے کر جیل جایا کرتے تھے۔ اس امید کے ساتھ کہ امی باہر آکر ہمیں ملیں گی لیکن ہمیں ملنے نہیں دیا جاتا تھا اور ہم روتے ہوئے واپس گھر آجاتے تھے۔ میری ماں کو میں نے ہمیشہ صبر کرتے دیکھا لوگوں کی اچھائیوں پر یقین کرتے دیکھا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ ریاست نے اس ملک کو کچھ نہیں دیا۔ یہاں کے لوگ بہت باہمت ہیں ذرا مشکل وقت آتا ہے تو ایک دوسرے کے لیے چھاؤں بن جاتے ہیں۔ ہماری قوم ایک ہیرے کی طرح ہے۔ بس اسے تراشنے کی ضرورت ہے۔ ان کی یہ بات بالکل سچ تھی میں نے امی کے انتقال کے بعد دو ہفتوں میں پاکستان کے لوگوں کی محبت

دیکھی، کہاں کہاں سے لوگ ہمارے گھر تعزیت کرنے آئے۔ کیا بتاؤں۔ مجھے ان کی صحت کو لے کر بہت ڈر لگا رہتا تھا، نظر آ رہا تھا کہ ان کی صحت تیزی سے گر رہی ہے لیکن اپنے کام اور زندگی کے مقصد کو لے کر بہت ہی پرعزم تھیں۔ آخری وقت تک حق اور سچ کے لیے لڑتی رہیں۔ میں نے کبھی فون کر کے کہنا کہ امی اپنی صحت کا خیال رکھا کریں یا آپ کی طبیعت کیسی ہے تو کہا کرتی تھیں کہ میں سمجھی تمہارا کسی اہم کام کے لیے فون آیا ہے۔ یعنی ان کے لیے اپنی صحت اہم نہیں تھی لوگوں کی خدمت کرنا اہم لگتا تھا۔ آٹھ برس قبل ان کو سٹنٹ لگایا گیا تھا، چھاتی کا سرطان ہوا تو ریڈی ایشن لگوا کر سیدھا دفتر پہنچ جایا کرتی تھیں۔ انہوں نے ہمیں مرتے دم تک ذرا برابر بھی تکلیف نہیں دی۔ بے نظیر کے زمانے میں امی نے ایک بچے کا کیس لڑا، جس پر توہین مذہب کا الزام تھا کس کے نتیجے میں اس لڑکے کے چچا کو کورٹ کے احاطے میں قتل کر دیا گیا۔ امی کو جان سے مارنے کی دھمکیاں ملیں اور اس کے بعد امی نے مجھے بورڈنگ سکول بھیج دیا۔ لندن جانے سے پہلے میرے ساتھ ساری تیاریاں کروائیں۔ اس وقت میری عمر پندرہ برس تھی، امی میرے ساتھ لندن گئیں وہاں کمرہ سیٹ کروایا اور مجھے سمجھایا کہ اب دل لگا کر پڑھنا ہے۔ میرا سونے کا وقت نو بجے کا تھا پہلی رات میں بے چین تھی دس بجے سوئی تو امی نے مجھے کال کی اور کہا کہ رات نو کی بجائے دس بجے کیوں سوئی تھی میں نے امی سے کہا کہ آپ کو کیسے پتہ چلا امی نے کچھ نہ بتایا۔ بہت برسوں کے بعد میں نے والدہ سے پوچھا کہ آپ کو کیسے پتہ چلتا تھا کہ میں رات دیر سے سوئی ہوں تو کہنے لگیں کہ تمہارے کمرے کے باہر ایک چھوٹی سی گلی تھی جہاں سے سب نظر آتا تھا میں وہاں کھڑی رہتی تھی اور دیکھتی رہتی کہ تم کب سو رہی ہو اور ساتھ روتی رہتی کہ اپنی بیٹی کو اپنے سے دور کر دیا ہے۔ ان کو جب بھی جان سے مارنے کی دھمکیاں ملیں انہوں نے اپنے اس ڈر اور خوف کو اپنے بچوں پر حاوی نہ ہونے دیا بلکہ یہی کہا کہ ڈرو مت بہادری سے حالات کا مقابلہ کرو اور میری فکر نہ کیا کرو۔ میں جب باہر سے پڑھ کر آئی تو دیکھا کہ امی کے بارے میں جہاں بہت سارے لوگ اچھی باتے کرتے تھے وہیں ان کی حب الوطنی پر بھی سوال اٹھائے جاتے تھے، مجھے بہت حیرت ہوئی کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور ہمارے ملک میں آج بھی اس چیز پر بحث ہوتی ہے کہ کون کیا کر رہا ہے یا کتنا محبّ الوطن ہے۔ میں کبھی اپنے بارے امی سے کچھ گفتگو کرتی یا پوچھتی کہ بتایئے میں یہ کروں یا نہ کروں تو کہا کرتی تھیں کہ تم خود فیصلہ کرو۔ میری والدہ مشترکہ خاندانی نظام میں رہتی تھیں انہوں نے اپنی فیملی کو جوڑ کر رکھنے میں ایک پل کا کردار ادا کیا۔ میرے دادا نے آخری وقت پر بھی اپنی اولاد کی بجائے میری امی پر انحصار کیا۔ میری والدہ کو سوسائٹی نے وہ اعتماد نہیں دیا جو ایک ایسی عورت کو ملنا چاہیے یہاں عورت گھر اور باہر کو جتنا مرضی اچھی طرح چلا لے لیکن اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی ہے۔ سرکاری اعزاز کے ساتھ دفنانے کے سوال پر منیزے کا کہنا تھا کہ ہم نے سرکاری اعزاز کا مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ خیر خواہوں نے اس اعزاز کا مطالبہ کیا جو کہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے۔ ہم اس سرکار سے کیسے سرکاری اعزاز مانگ سکتے تھے جس کے خلاف ساری عمر ہماری ماں لڑتی رہیں، آمروں کے ساتھ لڑتی رہیں۔ ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے انہوں نے کہا کہ میری والدہ نے اپنے بچوں کی پرورش میں کسی قسم کی کمی نہیں آنے دی۔ بچوں میں تو ان کی جان تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ہم سب انگلینڈ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں گئے۔ میرے بھائی کو آلو دقیمہ اور پراٹھا کھانے کی عادت تھی اس نے شور مچا دیا کہ میں تو آلو قیمہ اور پراٹھا ہی کھاؤں گا۔ اب وہاں ایسا انتظام نہ تھا ایک انڈین کے پاس پوٹلی میں کچھ مصالحے دیکھے تو امی نے اس سے مصالحے لیے قیمہ کسی بھی طرح منگوا کر بھائی کو آلو قیمہ بنا کر دیا وہ جس طرح سے اپنے کام سے مخلص تھیں اسی طرح ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کے خاندان کو بھی ان سے کوئی شکایت نہ ہو۔ ان کے بچوں کو ان کی کمی محسوس نہ ہو۔ بھٹہ مزدور کون ہوتے ہیں مجھے نہیں پتہ تھا، امی باہر سے آئیں تو ان کے ہاتھ اکثر گندے دیکھتی ایک بار پوچھا کہ آپ کے ہاتھ گندے کیوں ہوتے ہیں تو کہنے لگیں کہ میں بھٹہ پر گئی تھی وہاں تمہارے جیسے چھوٹے چھوٹے بچے کام کرتے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کرنے جاتی ہوں ان کے حقوق کے لیے لڑ رہی ہوں، چاہتی ہوں کہ یہ بھی معاشرے میں سر اٹھا کر جئیں۔ میری والدہ نے عورتوں کے لیے تو کام کیا ہی تھا لیکن بچوں کے لیے بہت کام کیا۔ وہ بہت ہی رحم دل تھیں ایک مرتبہ کسی بے سہارا بچے کو گھر لے آئیں اس کو کپڑے جوتے لے کر دیئے وہ بچہ شرارتی تھا مجھے تو اچھا نہ لگا امی چاہتی تھی یہ بچہ یہیں رہے پڑھے لکھے لیکن وہ بچہ کپڑے جوتے سب چھوڑ کر چلا گیا۔ کہنا تھا کہ میرے والد نے میری والدہ کو بہت سپورٹ کیا اس سے بڑی کیا بات ہوگی کہ بیوی اور بچوں کو جان سے مارنے کی دھمکیاں مل رہی ہوں اور وہ بندہ حالات کا سامنا کر رہا ہو۔ مجھے اور میری سہیلیوں کو امی سے ملنے کا بہت زیادہ شوق رہتا تھا آخری بار جب میں امی کے ساتھ ملی تو انہوں نے مجھے کہا کہ اپنی سہیلیوں کو بلواؤ میں نے کھانا بنایا ہے ہم نے ان کے ہاتھ کا کھانا کھایا۔ امی نوجوانوں میں بیٹھ کر بہت اچھا محسوس کرتی تھیں۔ وہ ہر بات کا ایک نیا پہلو تلاش کر لیا کرتی تھیں، ہر بحث کو صحیح سمت میں لے کر جاتی تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے جب میں سری لنکا جا رہی تھی تو امی نے مجھے کہا کہ میرے پاس کچھ سری لنکن پیسے ہیں میں ڈھونڈتی ہوں کہاں پڑے ہیں، فون کی سم بھی ڈھونڈ کر دیتی ہوں میں اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئی اور بھول گئی کہ امی نے مجھے ایسی کوئی بات کہی تھی لیکن امی آدھی رات کو میرے کمرے میں آئیں اور کہنے لگیں یہ لو پیسے اور سم اس کو استعمال کرنا۔ یہ تھی ان کی ممتا۔ منیزے نے کہا کہ بے نظیر بھٹو میری والدہ کی قریبی دوست تھیں۔ ہمارے نانا کے گھر آ کر رہا کرتی تھیں اس دوران امی بتاتی ہیں کہ بے نظیر پڑھتی رہتی تھیں صنم اور شاہنواز کھیلتے رہتے تھے شاہنواز تو میری امی کو ''آپا'' کہا کرتے تھے۔ 18 اکتوبر کو جب بے نظیر پر حملہ ہوا تو اس سے پہلے میری امی نے مجھے کہا کہ میں نے بے نظیر کے حوالے سے خواب اچھا نہیں دیکھا جس وقت دھماکہ ہوا میں وہی موجود تھی میں نے امی کو فون پر کہا کہ امی آپ پریشان تھیں یہاں ایسی کوئی بات نہیں، اتنی ہی بات کہہ رہی تھی کہ دھماکہ ہو گیا، میں بے نظیر بھٹو سے بعد میں ملی ان کو بتایا کہ امی پریشان تھیں تو بی بی کہنے لگیں کہ اپنی والدہ کی بات کو غور سے سنا کرو۔ میری امی بے نظیر سے بہت متاثر تھیں جب ان کا قتل ہوا تو کئی روز تک اپنے کمرے میں بند رہیں۔ ہماری والدہ ہمارا فخر تھی امید ہے کہ ان کا چھوڑا ہوا کام رکے گا نہیں چلتا رہے گا۔ عورتیں اپنے حقوق کے لیے لڑیں گی اور حالات کا مقابلہ بہادری سے کریں گی۔

(05 مارچ، 2018)

(نوائے وقت میگزین)

بھٹہ مزدور کون ہوتے ہیں مجھے نہیں پتہ تھا، امی باہر سے آئیں تو ان کے ہاتھ اکثر گندے دیکھتی ایک بار پوچھا کہ آپ کے ہاتھ گندے کیوں ہوتے ہیں تو کہنے لگیں کہ میں بھٹہ پر گئی تھی وہاں تمہارے جیسے چھوٹے چھوٹے بچے کام کرتے ہیں ان کی حوصلہ افزائی کرنے جاتی ہوں ان کے حقوق کے لیے لڑ رہی ہوں، چاہتی ہوں کہ یہ بھی معاشرے میں سر اٹھا کر جئیں۔ میری والدہ نے عورتوں کے لیے تو کام کیا ہی تھا لیکن بچوں کے لیے بہت کام کیا۔ وہ بہت ہی رحم دل تھیں ایک مرتبہ کسی بے سہارا بچے کو گھر لے آئیں اس کو کپڑے جوتے لے کر دیئے وہ بچہ شرارتی تھا مجھے تو اچھا نہ لگا امی چاہتی تھی یہ بچہ یہیں رہے پڑھے لکھے لیکن وہ بچہ کپڑے جوتے سب چھوڑ کر چلا گیا۔

# عاصمہ: تم جاوداں ہو اور کامران بھی

امتیاز عالم

عاصمہ کی یاد میں کیسے کیسے نذرانے، نوحے اور نغمے فضاؤں میں بکھر رہے ہیں۔ ایسا کسی کے انتقال پر اک مدت کے بعد سننے اور دیکھنے کو مل رہا ہے۔ کشور ناہید رقم طراز ہیں: اذیت پرستی کے سارے ناخدا نابود ہو جائیں گے، تمہاری بے چین اور پاک روح عاصمہ، تمام خاک پسند لوگوں کے چہروں کی خراشیں، سُبک نرم رو تازہ شگوفوں میں بدل دے گی، سب اُجاڑ بستیوں میں ہر روز تمہارے قدموں کی چاپ سُن کے، آزردہ اور بے نور آنکھیں بھی جگمگا اُٹھیں گی، اذیت پرستی کے سارے ناخدا نابود ہو جائیں گے، مگر تمہاری روح کبھی کیا اکشر، چڑیا کی آواز کے ساتھ اور سارے عالم میں بادلوں کی گرج کے ساتھ، ہمارے ساتھ کھڑی ہوگی، عاصمہ تم جاوداں ہو! ایسی ہی بہت آزردہ، پُر یقیں اور خوش فہم تحریریں عاصمہ کے لئے محبت کے پھول بکھیر رہی ہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں: ع

میرے مرنے پہ بھی وہ راضی نہیں
کیا ابھی کچھ بدگمانی اور ہے

اذیت پسند کیوں چپ ہوں گے؟ اُسے چتا میں جلانے سے، مخلوط جنازے پہ اُنگلیاں اُٹھانے اور جانے کیا کیا اور یہ ذعا بھی کہ آپ بھی اُس کے ساتھ راہِ عدم سدھاریں۔ اور ایسے ناداں دوست بھی جو اس بحث میں مگن ہیں کہ فرد اہم ہے کہ اجتماع۔ ساری عمر اُس نے طاغوتی قوتوں کو بیچ میدان کھڑے ہو کر للکارا تھا اور جاتے جاتے اس کے جنازے کا منظر بھی کذب و ریا کی پیروی کرنے والوں کو، ہمتِ کفر، جرأتِ تحقیق کی دعوت دے گیا۔ بھئی فرضِ کفایہ ہی تو ہے اور بس اللہ کے حضور مغفرت کی ذعا۔

خانہ کعبہ میں مخلوط عبادات ہو سکتی ہیں، تو جنازے میں عورتوں کی شرکت میں کیا قباحت؟ جانے کیوں عبادت گاہوں میں عورتوں کا داخلہ ممنوع ہے؟ مگر عاصمہ کے جنازے نے یہ روایت بھی توڑ دی کہ وہ تو تھی ہی بُت شکن۔ کون کون سے بُت تھے جو اُس نے بہ بانگِ دہل نہیں ڈھائے اور کون جابر تھا جو اس کی للکار کے سامنے ٹھہر سکا۔ آمریت کے بُت، انسانی حقوق سے انکار کے بُت، بچوں سے زیادتی کے بت، عورتوں کو آدھا انسان بنانے کے بُت، اقلیتوں کی تحقیر کے بت، طبقاتی تفریق کے بت، فرقہ واریت کے بت، جنگ وجدل کے بت، انسان دشمنی کے بت۔ کسی نے ان بتوں کی درگت ہوتے دیکھنی ہو تو وہ عاصمہ کے رزمیے کا ایک آدھ صفحہ ہی دیکھ لے۔ اُس کے بُت شکنی کے کلام کی تو نہ ختم ہونے والی جلدیں ہیں۔

ایسے میں یہ مشکل آن پڑتی ہے کہ ایسی نابر خاتون رہنما کو پکارا کیسے جائے۔ وہ ایک مخنی سی خاتون تھی بغیر کسی کروفر کے لیکن اُس میں جو بجلیاں موجزن تھیں وہ دیدنی تھیں۔ اتنی بے باکی، دلیری، بے خوفی کو کوئی کیسے بیان کرے۔ کسی نے کہا کہ وہ آئرن لیڈی ہے، ارے بھئی آئرن لیڈی تو مارگریٹ تھیچر بھی تھی جو عاصمہ کی بالکل ضد۔ یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک آہنی ارادے کی مالک خاتون تھی جس کے سامنے آہنی ادارے اور ناقابلِ تسخیر دیواریں بھی دہل دہل جاتی تھیں۔ کسی نے کہا کہ وہ ''مردانہ وار لڑی'' کہ کسی عورت کے یوں لڑنے کے لئے کوئی صنفی طور پر حساس محاورہ نہیں ہے۔ یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ زنانہ وار لڑی کہ پدر شاہی معاشرے میں اس کی مثال نہیں۔

جو اس پر غداری کے الزام لگاتے ہیں وہ کشمیر میں ہونے والے بہیمانہ تشدد پر اقوامِ متحدہ کے لئے اس کی رپورٹ ہی پڑھ لیں۔ یا پھر دلّی میں ہونے والے اُس تعزیتی اجلاس کی کارروائی دیکھ لیں جہاں اس کی ہمنوا ساتھی کملا بھاسین آزادی کے نعرے لگاتے ہوئے ذرا ہچکچا نہیں رہی تھیں۔ مشکل یہ ہے کہ عاصمہ جیسی ہمہ نوحریت پسند کے لئے پہلے سے کوئی سانچہ نہیں جس میں وہ سما جائے۔ آخر اُسے کسی ایک سانچے میں کیوں بند کیا جائے جبکہ وہ کسی سانچے میں ڈھلنے والی نہیں تھی۔

> اُسے کسی کی پروا تھی، نہ اپنی جان کی فکر۔ بس خالی ہتھیلی پہ وہ اپنا سر رکھ کر ہر ایک ظالم سے ٹکرانے کو ہر وقت تیار تھی۔ وہ ایک سچی عوامی رہنما تھی اور سیاسی کارکن جو کسی پارٹی کی رُکن نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی ذات میں ایک پارٹی تھی۔ اس جدوجہد میں وہ اکیلی نہیں تھی اور نہ وہ نظم وضبط سے آزاد تھی۔

عاصمہ کیا تھی؟ بس ایک نعرہ مستانہ، مزاحمت کی علامت اور چلتا پھرتا احتجاجی جلوس۔ انسانی حقوق ہوں یا شہری آزادیاں، آئین کی بالادستی ہو یا عوام کا اقتدارِ اعلیٰ، عورتوں سے تفریق ہو یا بچوں کے ساتھ ناروا سلوک، اُجرتی غلامی ہو یا کسانوں کی بدحالی، خطے میں امن ہو یا جنگجوئیت کی مخالفت، مذہبی عصبیت پسندی ہو یا نسلیاتی نابرابری، پارلیمنٹ کی بالادستی ہو یا پھر صحافت کی آزادی اور عدلیہ کی خودمختاری، بنگالیوں سے ناانصافی ہو یا بلوچوں سے زیادتی، دُنیا میں ظلم ہو یا خطے میں بربریت، وہ ناانصافیوں کے خلاف انصاف کی آواز تھی۔ اُسے کسی کی پروا تھی، نہ اپنی جان کی فکر۔ بس خالی ہتھیلی پہ وہ اپنا سر رکھ کر ہر ایک ظالم سے ٹکرانے کو ہر وقت تیار تھی۔ وہ ایک سچی عوامی رہنما تھی اور سیاسی کارکن جو کسی پارٹی کی رُکن نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی ذات میں ایک پارٹی تھی۔ اس جدوجہد میں وہ اکیلی نہیں تھی اور نہ وہ نظم وضبط سے آزاد تھی۔ اُس کا ایک واضح عوامی، جمہوری، انسانی اور سماجی نظریہ تھا۔ وہ ترقی پسند تھی، انسانیت پسند تھی، جمہوریت پسند تھی، سماج وادی تھی اور سیکولر مسلمان بھی۔ اس تاریخی جہد میں اُس نے کئی تنظیموں کی بنیاد رکھی جن کی قوتِ محرکہ میں پاکستان کے چوٹی کے دماغ اور نہایت مخلص رہنما کارکن شامل تھے۔ وہ تنِ تنہا بھی لڑتی تھی اور سب کو ساتھ ملا کر میدانِ کارزار میں اُترتی تھی۔ اگر ہیومن رائٹس کمیشن میں آئی اے رحمان، عزیز صدیقی، حسین نقی جیسے سینئر ایڈیٹرز اور جسٹس دراب پٹیل اور ایئر مارشل ظفر چوہدری جیسی مایہ ناز شخصیات تھیں تو ویمن ایکشن فورم میں پاکستانی خواتین کی نہایت زوردار آوازیں شامل تھیں۔ قانونی دادرسی کے لئے جو سیل AGHS بنا اُس کی روحِ رواں اُن کی بہن حنا جیلانی اور بہت سے وکیل تھے۔

عورتوں کی پناہ گاہ دستک مہہ ناز جیسی فنافل خواتین کے پاس تھی۔ بھٹہ مزدور تنظیموں، ٹریڈ یونینز، وکلا کی تنظیموں اور طرح طرح کی ترقی پسند اور عوامی جتھہ بندیوں کو عاصمہ کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ پاکستان میں عوامی جمہوری جدوجہد کی تاریخ میں تاریک راہوں میں مارے جانے والے سینکڑوں ہیروز میں عاصمہ بھی ایک تھی اور سب سے منفرد بھی۔ دو لفظوں میں یوں کہیے کہ وہ عوامی مزاحمت کی علامت تھی اور ہے۔

بقول فیض ع

شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے؟
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے؟
رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

عاصمہ کی بے وقت اور اچانک موت نے یقیناً ایک خلا پیدا کیا ہے اور اُسے پُر ہونے میں وقت لگے گا۔ لیکن اس کی روایت ہزاروں نوجوانوں کو مزاحمتی راہ پہ لائی ہے اور آج اس ملک میں انسانی حقوق کے لئے آواز اُٹھانے والوں کی کمی نہیں۔ رجعتی بالادستی، فکری جبس اور تحریکی ناطاقتی کے ماحول میں عاصمہ بڑی غنیمت تھی۔ اُس نے سارے جہاں کا غم اپنے سر لے رکھا تھا اور یار لوگ بے فکر رہتے کہ عاصمہ تو ہے، دیکھ لے گی۔ اب وہ نہیں رہی، اُس کی یاد تو ہے اور اس کی روایت کی درخشاں مثال بھی۔ معاشرتی بدلاؤ، انسانی حقوق و آزادیوں کا تحفظ، جمہوری شجر کی آبیاری اور انسان دوستی کا چلن آسان کام نہیں۔ نہ ہی یہ ایک آدھ نسل یا چند اشخاص کے بس کا کام ہے۔

جو سماجی و تحریکی بوجھ اُس نے اُٹھا رکھے تھے، اُنہیں آج بانٹنے کی ضرورت ہے۔ جمہوری تحریک کے انہدام اور انقلابی تحریک کے اسقاط کے زمانے میں یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ غلطیوں سے سیکھا جائے اور نئی راہیں استوار کی جائیں۔ اب ایک ایسے کم از کم سماجی جمہوری ایجنڈے کی ضرورت ہے جو سب ترقی پسند اور عوامی قوتوں کو متحد کر دے۔ بکھری ہوئی کاوشوں کو ایک لڑی میں پرو دے اور سیاست کی موجودہ بے ثباتی میں اُمید کی کرن بن کر سامنے آئے۔ عاصمہ سے ہماری محبت تقاضا کرتی ہے کہ ع

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل ونہار رکھتے ہیں

(12 فروری، 2018)

(روزنامہ جنگ)

# عاصمہ جہانگیر، ایک بہادر عورت

فرخ سہیل گوئندی

جنرل ضیاء الحق کی آمریت میں دو بہنوں عاصمہ جیلانی اور حنا جیلانی نے اپنی جدوجہد اور بہادری کے حوالے سے یکا یک نام کمایا۔ ملک غلام جیلانی کی ان دو بیٹیوں نے آئینی جدوجہد کی قانونی جنگ میں جو نام کمایا، وہ پاکستان کی سیاسی اور قانونی تاریخ کا اہم باب ہے۔ ان دنوں لاہور میں چند ایک خواتین ہی مرد وکلا کے ساتھ سفید شلوار قمیص اور کالے کوٹ کے ساتھ دیکھنے کو ملتی تھیں۔ ان میں عاصمہ جیلانی اور حنا جیلانی کے علاوہ طلعت یعقوب، ریحانہ سرور نمایاں تھیں۔ اپنی شہرت اور جدوجہد کے آغاز میں عاصمہ جیلانی شادی کے بعد عاصمہ جہانگیر ہوگئیں۔ جنرل ضیاء الحق کے خلاف مشترکہ سیاسی جدوجہد کی بنیاد لاہور ہائیکورٹ کے وکلاء نے ڈالی جن میں محمود علی قصوری نمایاں تھے۔ جدوجہد کے اس نقطہ آغاز کے بعد جن لوگوں نے اسے بھرپور طریقے سے منظّم کیا، ان میں جناب سید افضل حیدر، عابد حسن منٹو، رفیق چوہان، ملک محمد قاسم، اعتزاز احسن، عاصمہ جہانگیر اور حنا جیلانی و دیگر وکلاء کے ہمراہ نمایاں طور پر متحرک نظر آئے۔ ان دنوں لاہور ہائی کورٹ سیاسی مزاحمت کا سب سے بڑا اور شاید واحد مرکز تھا جہاں جنرل ضیا کے باغی اکٹھے ہوتے جن میں وکلاء کے علاوہ دیگر سیاسی جماعتوں کے سیاسی کارکن بھی شامل ہوئے۔ وکلاء کے اسی اتحاد نے جنرل ضیاء کی آمریت کے خلاف وکلاء تحریک شروع کی اور بعد میں اسی وکلاء تحریک کے بطن سے پاکستان کا طویل ترین مدت تک قائم رہنے والے سیاسی جماعتوں کے اتحاد (ایم آر ڈی) (تحریک بحالی جمہوریت) نے جنم لیا۔ اسی 11 جماعتی سیاسی اتحاد نے جنرل ضیاء کی آمرانہ حاکمیت کے خلاف دبنگ جہد مسلسل کی۔ ایم آر ڈی کی تحریک میں شامل سیاسی کارکنوں کو قانونی معاونت کے لیے ایک گمنام ساتھی جناب لیاقت حسین وڑائچ ایڈووکیٹ مرحوم نے آغاز کیا تو یہ جدوجہد کرنے والوں کے لیے ایک واحد سہارا ثابت ہوا۔ عاصمہ جہانگیر نے ان کے ہمراہ قانونی معاونت میں اپنا حصہ ڈالنا شروع کیا۔ جنرل ضیاء کے خلاف سڑکوں پر جمہوریت اور آئین کا مطالبہ کرنا سنگین جرم تھا اور جو جلوس نکالتا اس کو عقوبت خانوں، زندانوں اور مقدمات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اب وہ کوئی خوف انگیز افسانہ لگتا ہے۔ راقم نے انہی دنوں عاصمہ جہانگیر کو لاہور کی سڑکوں پر مہناز رفیع سمیت دیگر خواتین کے ساتھ نعرہ بغاوت بلند کرتے دیکھا۔ لیاقت حسین وڑائچ کے کام سے وہ اس قدر متاثر ہوئیں کہ انہوں نے اس جدوجہد کو مزید مستحکم کرنے کے لیے جیلانی فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی جس کا دفتر ان کے اپنے لاء آفس واقع ہال روڈ میں تھا۔ بعد میں جیلانی فاؤنڈیشن سے ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان بنا۔ اس کی بنیاد سیاسی کارکنوں، وکیلوں اور صحافیوں نے مل کر رکھی جن میں یحییٰ بختیار، دراب پٹیل، نثار عثمانی، حبیب جالب، منو بھائی اور دیگر لوگ بھی شامل تھے۔ عاصمہ جہانگیر نے سیاسی کارکنوں کی قانونی جنگ کے ساتھ ہی عورتوں کے حقوق کی جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالنا شروع کردیا جس کے لیے طاہرہ مظہر علی خان مرحومہ کی قیادت میں بننے والا ادارہ ویمن ایکشن فورم پاکستان میں خواتین کی جدوجہد کے حوالے سے ایک سنگِ میل ثابت ہوا۔ عاصمہ جہانگیر نے انسانی حقوق کی اس جدوجہد سے بھٹہ مزدوروں کے حقوق کو جوڑا جس میں احسان اللہ خان کا ذکر نہ کیا جائے تو تاریخ سے زیادتی ہوگی۔ اور ایک بات نہیں بھولنی چاہیے کہ عاصمہ جہانگیر انسانی اور عوامی حقوق کی اس جدوجہد کو صرف عدالتوں کے اندر ہی نہیں لڑتی رہیں بلکہ وہ شہر شہر سڑکوں پر ہم سب کے ساتھ شامل ہوئیں۔ میں ان کے حوالے سے جدوجہد کے چند واقعات کبھی نہیں بھولوں گا۔ ان میں حبیب جالب اور بشریٰ اعتزاز کے ہمراہ ان کا جنرل ضیاء کی پولیس کے ہاتھوں پٹنا نمایاں ہے۔ یہ جلوس جہاں پاکستان میں سیاسی تاریخ میں انمنٹ اثرات چھوڑ گیا، وہیں چار اور چار دیواری کے تحفظ کے دعوے دار جنرل ضیاء کی طرف سے عورتوں پر تشدد کے بعد یہ واقعہ خواتین کے حقوق کا پہلا اور اہم ترین سنگ میل تو ثابت ہوا، مگر ساتھ ہی جنرل ضیاء کی آمریت میں ایک ایسا شگاف ڈال گیا، جو وقت کے ساتھ پھیلتا چلا گیا۔ اس مظاہرے میں شامل ہونا پانچ سال قید اور دس کوڑوں کا سزاوار ٹھہرایا جانا تھا۔ راقم سیاسی جدوجہد کے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ اس مظاہرے میں بڑے جوش و خروش سے شامل تو تھا، لیکن جب مظاہرے میں شامل حبیب جالب اور خواتین کے سروں پر پولیس کے ڈنڈے پڑے تو پھر وہ کچھ ہوا جو ریاستی تشدد کے خلاف کارکن Street Fights میں کرتے ہیں۔

عاصمہ جہانگیر نے سیاسی کارکنوں کی قانونی جنگ کے ساتھ ہی عورتوں کے حقوق کی جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالنا شروع کردیا جس کے لیے طاہرہ مظہر علی خان مرحومہ کی قیادت میں بننے والا ادارہ ویمن ایکشن فورم پاکستان میں خواتین کی جدوجہد کے حوالے سے ایک سنگِ میل ثابت ہوا۔

جنرل ضیاء نے جب اپنی آمریت کو جعلی ووٹوں کے عمل سے قانونی حیثیت دینے کے لیے ریفرنڈم کا انعقاد کیا تو اس روز 19 دسمبر 1984 کو مسجد شہداء لاہور میں ایم آر ڈی نے جلسے کا انعقاد کیا۔ جلسہ مسجد کے صحن میں منعقد ہوا جس میں تین چار سو لوگ شامل تھے۔ مسجد کے گرد حصار بنانے اور پوری مال روڈ کو سیل کرنے کے لیے سینکڑوں پولیس والے تعینات تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ فوجی جیپیں لوڈڈ بندوقیں تانے سڑکوں پر گشت کر رہی تھیں۔ جلسہ ابھی جاری تھا کہ چند سیاسی کارکن مسجد سے باہر آئے اور نعرے بلند کرنے لگے۔ اس دوران عاصمہ جہانگیر بشمول شاہ تاج صاحبہ کے پانچ چھ خواتین کی ٹولی لے کر سڑک پر نکل آئیں۔ میرے ہمراہ دو سیاسی کارکن تھے۔ ہم عاصمہ جہانگیر سے کافی فاصلے پر نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھے۔ اس دوران ایک پولیس والا اپنے بازوؤں کی پوری طاقت سے آٹھ فٹ لمبا اور موٹا بانس کا ڈنڈا لیے عاصمہ کے پیچھے تھا۔ عاصمہ جہانگیر اور ان کی ساتھیوں کو قطعاً علم نہیں تھا کہ پیچھے سے ایک وردی والا ان پر مکمل طاقت سے وار کرنے کو تھا۔ اس دوران سڑک کنارے پڑی بجری کے بھاری پتھر سے یہ پولیس والا گھائل ہوگیا۔ اس کا قاتل ڈنڈا بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین بوس ہوگیا۔ عاصمہ جہانگیر، آئین بحال کرو، ریفرنڈم مردہ باد، کے نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ گئیں اور ہم دونوں کارکن بھی۔ کیا معلوم کہ وہ بھاری ڈنڈا ان کے سر پر پڑ جاتا۔

عاصمہ جہانگیر ہم جیسی کارکن تھیں۔ جب وہ عدالت میں قانونی جنگ لڑتیں تو جان دار وکیل اور سڑک پر جدوجہد کرتیں تو دبنگ سیاسی کارکن کی طرح۔ ایسے سینکڑوں مظاہروں میں راقم بھی عملی طور پر حصہ رہا اور گواہ بھی۔ پہلی خلیجی جنگ اور دوسری خلیجی جنگ کے دوران راقم نے فاروق طارق اور بائیں بازو کے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ اینٹی گلف وار کمیٹی کے تحت لاہور سمیت ملک کے تمام شہروں میں جو مظاہرے منعقد کیے، وہ پاکستان کی سیاست میں کبھی نہیں بھلائے جاسکتے۔ عاصمہ جہانگیر ان مظاہروں میں ویسے ہی شامل ہوئیں جیسے اینٹی گلف وار کمیٹی کے منتظمین نے طے کیا۔ وہ امریکہ کی عراق میں مداخلت، فلسطین، اسرائیلی جارحیت اور لبنان پر اسرائیلی جنگ

مسلط کئے جانے کے خلاف ہم جیسے ترقی پسندوں کے مظاہروں میں دل وجان سے شامل ہوجائیں۔

2010ء میں سابق وزیر قانون جناب بابر اعوان نے سابق صدر آصف علی زرداری کی اس خواہش کو میرے ساتھ شیئر کیا کہ صدر آصف زرداری چاہتے ہیں کہ عاصمہ جہانگیر سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کا الیکشن لڑیں۔ میں نے بابر اعوان صاحب سے عرض کی کہ جہاں تک میں عاصمہ جہانگیر کے مزاج سے آشنا ہوں، اگر آپ کی جماعت جو کہ اب حکمران ہے، وہ اس خواہش کا اظہار کرے تو عاصمہ جہانگیر قطعاً اس خواہش کو پورا نہیں کریں گی۔ لہٰذا گورنر ہاؤس میں ایک ڈنر رکھا گیا جس میں پانچ چھ لوگ شریک ہوئے، اس ڈنر میں غیر محسوس انداز میں اس بحث کو چھیڑا گیا کہ سپریم کورٹ بار کا صدر ایک آزاد فکر رکھنے والی شخصیت کو ہونا چاہیے۔ راقم نے اس بحث کو طے شدہ منصوبے کے مطابق کچھ ایسے جاری رکھا کہ قرعہ، عاصمہ جہانگیر کے نام نکل آئے اور ڈنر کے اختتام پر ایک بزرگ دوست کی یہ ''دانش مندانہ'' ذمہ داری لگائی کہ وہ عاصمہ کو اس کے لیے تیار کریں۔ انہوں نے میرے کہنے کے مطابق مرحومہ عاصمہ جہانگیر کو اس کے لیے قائل کرلیا کہ وہ سپریم کورٹ بار کا الیکشن لڑیں۔ انہوں نے الیکشن لڑا اور جیت گئیں۔ لیکن یہ راز کبھی بے نقاب نہ کیا گیا کہ ان کو سپریم کورٹ بار کی صدارت کے لیے کیسے اور کس نے ''غیر محسوس انداز'' میں قائل کیا۔ اس لیے کہ وہ سیاسی جماعتوں کے نام نہاد ڈسپلن سے بالاتر تھیں۔ جب انہوں نے سپریم کورٹ بار کا الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا، راقم نے انہیں پی ٹی وی میں اپنے پروگرام ''تناظر'' میں بطور مہمان مدعو کیا۔ انٹرویو ریکارڈ ہوا تو میں نے ان سے عرض کی کہ اب آپ نے کسی ٹی وی چینل کو انٹرویو نہیں دینا، وہ آپ کا انٹرویو کم اور آپ کو رسوا زیادہ کریں گے اور یہی ان کا وتیرہ ہے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ جس روز الیکشن جیت رہی تھیں، سابق وزیر قانون ڈاکٹر بابر اعوان نے لاہور میں ایک وزیر کے ہاں ڈنر رکھا۔ نتائج مکمل ہوئے۔ عاصمہ جہانگیر جیت گئیں۔ کمرے میں موجود تمام صحافی وزیر قانون کو مبارک بادیں رہے رہے تھے۔ بابر اعوان نے کہا، اس کا سارا کریڈٹ گوئندی کو جاتا ہے۔ بڑے بڑے صحافی اس تبصرے پر چونک گئے۔ عاصمہ جہانگیر میرے لیے Street Fighting کی ایک دبنگ ساتھی تھیں اور یوں 11 فروری 2018ء کو ہم کئی محاذوں پر لڑنے والے جنگجو سے محروم ہوگئے۔

(17 فروری، 2018)

(روزنامہ نئی بات)

# عاصمہ جہانگیر: پیچھے نہیں ہٹنا، آواز اٹھانی ہے

ڈاکٹر پرویز طاہر

عاصمہ سے متعلق میری پہلی یادیں ان دنوں سے تعلق رکھتی ہیں جب وہ ابھی جیسوز اینڈ میری کانونٹ میں پڑھتی تھیں۔ سپریم کورٹ کے جج صبیح الدین احمد مرحوم جوان کے کزن تھے وہ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ان کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ہم اکٹھے ماسٹرز ڈگری مکمل کررہے تھے۔ زیادہ تر چھٹی کے روز ایسا ہوتا تھا کہ میں اور صبیح ان کے گلبرگ والے گھر کے برآمدے میں بیٹھ جاتے تھے اور رات گئے تک گپیں ہانکا کرتے تھے۔ عاصمہ کے والد ملک غلام جیلانی ایک جوشیلے کارکن اور ایک مشہور سیاسی میزبان تھے اور ان کے مہمانوں میں ذوالفقار علی بھٹو اور باقی بلوچ جیسے لوگ بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ گھرانہ تھا جو کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عاصمہ کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس میں انہیں کسی بات کا خوف نہیں تھا۔ میں نے آج تک عاصمہ جہانگیر کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ ابھی میں منو بھائی کی وفات کے صدمے سے سنبھل نہیں پایا تھا اور میری ذہنی کیفیت ایسی ہو چکی تھی کہ میں عاصمہ کے جنازے کے علاوہ ان کی یاد میں ہونے والی کسی بھی تقریب میں شریک نہیں ہو پایا۔ شاید میرے اندر کا ماہر معیشت امرتا سین کی طرف سے حوصلہ افزائی کا منتظر تھا جنہوں نے کہا ہے کہ عاصمہ جہانگیر کی عظمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ایک اور ممتاز معیشت دان البرٹ ہرش مین نے اس وقت ایک کتاب لکھی تھی جب عاصمہ ابھی جوان ہورہی تھیں۔ اس کتاب کا موضوع کچھ غیر معاشی سا تھا۔ نام تھا 'ایگزٹ، وائس اینڈ لائلٹی' (اخراج، آواز اور وفاداری)۔ یہ وہ موضوع تھا جس پر نظر ثانی کیلئے مجھے ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے آئی اے رحمان کہتے رہے۔ آخر شہری تب کیا کریں جب ان کا سامنا انتہائی غیر تسلی بخش صورتحال سے ہوجائے؟ وہ اس سے بچنے کیلئے اپنی قدموں کا استعمال کر کے بھاگ سکتے ہیں۔ اور کئی لوگوں نے ایسا کیا بھی اور جنرل ضیاء کے ظالمانہ دور میں دوسرے ملکوں میں پناہ لے لی۔ عاصمہ جہانگیر نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے سڑکوں پر نکل کر حدود آرڈیننس کے خلاف مظاہرہ کیا جسے امرتا نے ان کی انتہائی گہری ہمت قرار دیا ہے۔ ان کا بائیں بازو سے تعلق منو بھائی جیسا نہیں تھا بلکہ انہوں نے ہرش مین کی آواز والی آپشن کو استعمال کرلیا۔ ان کا کہنا تھا کہ شہریوں کو بھاگنے کی بجائے آواز اٹھانی چاہیے۔

> آواز سے ایک متحرک سول سوسائٹی جنم لیتی ہے۔ پھر آواز اٹھانے سے حمایت، باہم احترام یا ہرش مین کے الفاظ میں وفاداری جنم لیتی ہے۔ حدود آرڈیننس کے خلاف آواز اٹھائی گئی تو ویمن ایکشن فورم کا جنم ہوا۔ عاصمہ جہانگیر نے عاصمہ جیلانی کے مشہور زمانہ کیس میں وکیل بننے سے بہت پہلے ہی فوجی آمر کے خلاف کیس لڑ کر جیت لیا تھا۔

آواز سے ایک متحرک سول سوسائٹی جنم لیتی ہے۔ پھر آواز اٹھانے سے حمایت، باہم احترام یا ہرش مین کے الفاظ میں وفاداری جنم لیتی ہے۔ حدود آرڈیننس کے خلاف آواز اٹھائی گئی تو ویمن ایکشن فورم کا جنم ہوا۔ عاصمہ جہانگیر نے عاصمہ جیلانی کے مشہور زمانہ کیس میں وکیل بننے سے بہت پہلے ہی فوجی آمر کے خلاف کیس لڑ کر جیت لیا تھا۔ جب ایک بار وہ وکیل بن گئیں تو انہوں نے بچوں، اقلیتوں، کارکنوں، مزارعوں، سماجی تنہائی کا شکار لوگوں، سیاست سے بے دخل کئے گئے افراد، آئینی طور پر تنہائی کا شکار لوگوں، توہین مذہب کے الزامات کا سامنا کرنے والوں اور مذہبی شدت پسندی کا شکار لوگوں کے حقوق کا دفاع کیا۔ ان کی آواز ان لوگوں کیلئے بھی تھی جو ان کی مخالفت کرتے تھے۔ یہ سب لوگ بھی ان کے جنازے میں شرکت کیلئے آئے۔ وہ اس فقرے کی عملی تصویر تھیں کہ مجھے آپ کی بات سے اختلاف ہے لیکن میں اسے کہنے کے آپ کے حق کا مرتے دم تک دفاع کروں گی''۔ ہرش مین نے اصلاحات کے خلاف ہونے والے ردعمل کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے انہی لوگوں کا نقصان ہوگا جنہیں فائدہ پہنچانا مقصود ہے۔ توہین مذہب اور خواتین کے حقوق کے معاملے میں عام خوف یہی تھا۔ لیکن عاصمہ نے اس حوالے سے اپنی جدوجہد سے اس سوچ کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ ان اصلاحات کی بھاری قیمت ادا کرنا ہوگی جس سے یہ اصلاحات ناکام ہوجائیں گے۔ عاصمہ کیلئے کوئی بھی قیمت بہت زیادہ نہیں تھی خاص طور پر جب بات شہری آزادیوں اور سیاسی حقوق کی ہو۔ وہ قیمت کا اندازہ لگنے سے بہت پہلے ہی معاملات کو بہت بڑھا دیتی تھیں۔ ایم آر ڈی کی تحریک اور لاہور میراتھان اس کی صرف دو مثالیں ہیں۔ آخر میں یہ کہا جاتا ہے کہ اصلاحات کے نتیجے میں کوئی اور قیمتی چیز تباہ ہوجائے گی۔ عاصمہ نے اس تباہی کے مقابلے کیلئے عدلیہ کی حد سے زیادہ سرگرمیوں اور جمہوری کریش دونوں کا مقابلہ کیا۔

(3 مارچ، 2018)

(روزنامہ مشرق)

# محروم معاشرے کا اثاثہ

غازی صلاح الدین

بات تو عاصمہ جہانگیر کی کرنی ہے لیکن لکھنے بیٹھا ہوں تو نہ جانے کہاں سے گلیلیو دھم سے میرے دھیان میں آ بیٹھا ہے۔ اور وہ بھی عظیم جرمن ڈرامہ نگار بریخت کی ایک تخلیق کے حوالے سے۔ تو چلئے پہلے گلیلیو کو نمٹاتے ہیں کہ جو سترھویں صدی کا اطالوی ماہر فلکیات اور فلسفی تھا۔ اس کی سائنسی دریافتیں قدامت پرست مذہبی پیش واؤں کے عقائد سے متصادم تھیں۔ رومن کیتھولک کلیسا نے گلیلیو پر مقدمہ دائر کر دیا۔ شدید دباؤ ڈالا گیا کہ گلیلیو اپنی دریافتوں سے منکر ہو جائے۔ اور ایسا ہوا کہ گلیلیو نے سر جھکا لیا اور توبہ کر لی۔ بریخت نے اپنے ڈرامے میں اس موقع پر گلیلیو کے شاگردوں کی مایوسی کا ذکر کیا اور ان میں ایک نے اپنے استاد سے یہ شکوہ کیا کہ بدبخت ہے وہ ملک کہ جس میں کوئی ہیرو پیدا نہ ہو۔ اب سنئے کہ گلیلیو نے اس کا کیا جواب دیا اور ظاہر ہے کہ یہ بریخت کے ڈرامے کا مکالمہ ہے جس کا ترجمہ میں کچھ یوں کروں گا کہ ''نہیں..... بدبخت ہے وہ ملک جسے ہیرو کی ضرورت ہو'' بات ذرا گہری ہے۔ ہیرو کی ضرورت ہوتی ہی کسی ایسے ملک اور معاشرے کو جو مشکلات میں گھرا ہو اور جہاں قدامت پرست اور کٹر قوتیں ترقی اور نئے خیالات پر کفر کا فتویٰ لگاتی ہوں۔ گویا گلیلیو ہیرو بننے کو تیار نہ تھا کیونکہ اس میں جاں کا زیاں بھی ممکن تھا۔ بریخت نے اپنا یہ ڈراما ہٹلر کے عروج کے زمانے میں تحریر کیا تھا اور یہ انتہا پسند آمرانہ قوتوں اور سائنسی حقائق کے درمیان تناؤ کا ایک استعارہ تھا۔ اس ڈرامے میں یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ جبر کے ماحول میں سچائی کا دفاع کس حد تک کیا جا سکتا ہے۔

اس ڈرامے کی معنویت کچھ ایسی تھی کہ ضیاء الحق کے زمانے میں اسے اردو میں اسٹیج کیا گیا۔ اسلم اظہر نے مرکزی کردار ادا کیا اور ہمارے اپنے عمران اسلم بھی اس کا ایک نمایاں حصہ تھے۔ اب پتہ نہیں کہ گلیلیو کی مداخلت میرے اس بیان پر کیا اثر ڈالے گی البتہ گلیلیو سے رخصت ہوتے وقت اس کا ایک مقولہ یاد کر لیتے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ میں یہ نہیں مان سکتا کہ جس خدا نے ہمیں عقل اور شعور اور احساس سے نوازا ہے وہ یہ چاہے گا کہ ہم اپنی ان صلاحیتوں سے دستبردار ہو جائیں۔ اور ہاں ایک اور اہم بات۔ موجودہ عہد میں پاپائے اعظم نے کلیسا کی جانب سے گلیلیو سے معافی مانگی ہے۔ یہ تسلیم کیا ہے کہ گلیلیو حق پر تھا اور اس وقت کے مذہبی رہنماؤں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔ اور اب عاصمہ جہانگیر کا کچھ ذکر۔ اور پہلے یہ وضاحت کہ میں ان کا گلیلیو کے ساتھ کوئی موازنہ نہیں کر رہا۔ بس یہ سوال اٹھایا ہے کہ کسی ملک میں ہیرو کی ضرورت اور پھر اس میں کسی ہیرو کے ابھرنے سے اس کی خوش قسمتی یا بدنصیبی کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ گلیلیو کی موت کو چند برسوں بعد پانچ سو سال ہو جائیں گے۔ دنیا ظاہر ہے کہ بہت بدل چکی ہے۔ لیکن نظریات کی جنگ جاری ہے۔ ناقابل یقین سماجی اور سائنسی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ قرون وسطیٰ کی سوچ اور تعصّبات بھی ابھی زندہ ہیں۔ قدامت پرستی اور روشن خیالی کی جنگ پاکستان میں کس طرح جاری ہے۔

عاصمہ جہانگیر اس کی ایک روشن علامت ہیں۔ میری نظر میں وہ اس مصیبت زدہ ملک کی خوش قسمتی بن کر زندہ رہیں اور اس کی گواہی وہی لوگ دے رہے ہیں کہ جو ان سے نفرت کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان کی سوچ کیا ہے۔ ان کے نظریات کیا ہیں اور ان کیمقاصد کیا ہیں۔ ہم کبھی کبھی اپنے دشمنوں سے پہچانے جاتے ہیں۔

عاصمہ جہانگیر اس کی ایک روشن علامت ہیں۔ میری نظر میں وہ اس مصیبت زدہ ملک کی خوش قسمتی بن کر زندہ رہیں اور اس کی گواہی وہی لوگ دے رہے ہیں کہ جو ان سے نفرت کرتے ہیں۔ آپ دیکھیں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان کی سوچ کیا ہے۔ ان کے نظریات کیا ہیں اور ان کیمقاصد کیا ہیں۔ ہم کبھی کبھی اپنے دشمنوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہماری ہمت اور عزم اور حوصلے کا امتحان بھی یہی ہے کہ ہم کن مخالف قوتوں کو کس طرح للکارتے ہیں اور کس ثابت قدمی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ انسانی حقوق اور مظلوم طبقات کے لئے عاصمہ جہانگیر نے جو جنگ لڑی اس کی کوئی مثال نہیں۔ آپ بس یہ دیکھ لیں کہ پوری دنیا میں ان کی خدمات کا کس انداز میں اعتراف کیا گیا ہے۔ انسانی حقوق کی تحریک کے حوالے سے انہیں عالمی سطح پر سراہا گیا ہے۔ اس طرح وہ ہمارے ملک کی آبرو بن کر زندہ رہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ پاکستان کا نام ان چند خواتین نے روشن کیا کہ جنہیں ان کے اپنے ملک میں اتنی دشواریاں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لاہور میں اپنی موت سے صرف چھ دن پہلے وہ برطانیہ میں، آکسفورڈ یونیورسٹی کی ایک تقریب میں شریک تھیں۔ یہ بے نظیر بھٹو کی دسویں برسی کے حوالے سے منعقد کی گئی تھی۔ مقررین میں جو دو نام سب سے نمایاں تھے وہ عاصمہ جہانگیر اور ملالہ یوسف زئی کے۔ کوئی دوسرے تین نام آپ بتا سکتے ہیں کہ جو ایک جدید، مہذب، پرامن اور جمہوری پاکستان کی ان سے بہتر علامت بن سکتے ہیں؟ عاصمہ جہانگیر کے انتقال کی خبر ہمیں گزشتہ اتوار کی سہ پہر ملی۔ تب سے اب تک وہ مسلسل جیسے ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کے بارے میں خبریں، کالم اور گفتگو جاری ہے۔

اس کے علاوہ وہ ان بے شمار افراد کی یادوں میں ایک روشنی کی مانند موجود ہیں کہ جن کی زندگی کو انہوں نے کسی نہ کسی انداز میں چھوا تھا۔ میں نے بھی پہلے یہ سوچا تھا کہ اس کالم کے لئے میں اپنی چند یادوں کا انتخاب کروں گا۔ پھر میں نے یہ ارادہ بدل دیا کیونکہ 20 سال کے عرصے پر محیط ان یادوں کو سمیٹنا ایک مشکل کام ہے۔ پھر اس کالم کا دامن بھی تنگ ہے اور کئی باتوں کے کہنے کا ڈھنگ بھی مجھے نہیں آتا۔ یہ یادیں اپنے قبیلہ بلکہ عاصمہ جہانگیر کے قبیلے کے افراد کے ساتھ گفتگو میں یا کبھی کبھی بغیر کچھ کہے ہی دہرائی جا سکتی ہیں۔ یہ قبیلہ کن لوگوں پر مشتمل ہے اس کا اندازہ آپ عاصمہ جہانگیر کے جنازے میں شامل خواتین و حضرات کو دیکھ کر کر سکتے ہیں۔ ایک طرح سے اس پاکستان کی روح وہاں موجود تھی جس کا خواب وہ لوگ دیکھتے ہیں جو انسانی حقوق، سماجی انصاف اور باوقار آزادی کے لئے کوشاں ہیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس ملک میں بہت لوگ عاصمہ جہانگیر کو ناپسند کرتے ہیں بلکہ نفرت بھی کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ میری نظر میں اس کی بنیادی وجہ وہ حکمراں خیالات ہیں جو زندگی کے حقائق کے بارے میں کھل کر گفتگو کی اجازت نہیں دیتے۔ وہی بات جو فیض نے کہی تھی کہ چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے۔ اور یہ دیکھئے کہ معاشرہ میں کس کس چیز کی کمی ہے۔ علم اور مکالمے کی کمی ہے۔ برداشت اور رواداری کی کمی ہے۔ سماجی انصاف کی کمی ہے۔ اور اب تو افسوس یہ ہے کہ عاصمہ جہانگیر کی بھی کمی ہے۔

(17 فروری، 2018)

(روزنامہ جنگ)

# عاصمہ کی مشعل کون اٹھائے گا

انجم نیاز

مستقبل میں عاصمہ جہانگیر کی مشعل کون اٹھا کر دوڑے گا؟ ان کی جوت کون جگائے رکھے گا؟ اب تاریکی کا شکار بے آواز پاکستانیوں کیلئے صرف بہادر، دلیر اور ہمت والے لوگ ہی لڑیں گے۔ صرف وہی لوگ کرپٹ ایلیٹ کلاس کا مقابلہ کریں گے جن کے ضمیر زندہ ہیں۔ کچھ ہی لوگوں میں یہ ہمت ہے کہ وہ ان غیر انسانی، مذہبی قدامت پسند اور ظالم قوتوں کا مقابلہ کریں جو مسلسل پاکستان پر اپنی گرفت مضبوط رکھے ہوئے ہیں۔ عاصمہ کے تاریخی کیریئر نے کئی لوگوں کو متاثر کیا لیکن اب سوال یہ ہے کہ ان کے نقش قدم پر کون چلے گا؟ یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

اُن کے ساتھی آئی اے رحمان کو امید ہے کہ بہت سے نوجوان مرد و خواتین جو عاصمہ سے متاثر ہیں اور جن کی عاصمہ نے تربیت کی تھی اور وہ ان کے ساتھ کام بھی کر چکے تھے وہی لوگ اب آگے آئیں گے۔

جب 2005 کے زلزلے سے پاکستان کو شدید نقصان اٹھانا پڑا تھا تو عاصمہ جہانگیر نے نیویارک میں پریمیرز ایشیا سوسائٹی میں ماحولیات کے حوالے سے بات کی تھی۔ اس وقت

مستقبل میں عاصمہ جہانگیر کی مشعل کون اٹھا کر دوڑے گا؟ ان کی جوت کون جگائے رکھے گا؟ اب تاریکی کا شکار بے آواز پاکستانیوں کیلئے صرف بہادر، دلیر اور ہمت والے لوگ ہی لڑیں گے۔ صرف وہی لوگ کرپٹ ایلیٹ کلاس کا مقابلہ کریں گے جن کے ضمیر زندہ ہیں۔ کچھ ہی لوگوں میں یہ ہمت ہے کہ وہ ان غیر انسانی، مذہبی قدامت پسند اور ظالم قوتوں کا مقابلہ کریں جو مسلسل پاکستان پر اپنی گرفت مضبوط رکھے ہوئے ہیں۔ عاصمہ کے تاریخی کیریئر نے کئی لوگوں کو متاثر کیا لیکن اب سوال یہ ہے کہ ان کے نقش قدم پر کون چلے گا؟ یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔
ان کے ساتھی آئی اے رحمان کو امید ہے کہ بہت سے نوجوان مرد و خواتین جو عاصمہ سے متاثر ہیں اور جن کی عاصمہ نے تربیت کی تھی اور وہ ان کے ساتھ کام بھی کر چکے تھے وہی لوگ اب آگے آئیں گے۔

برنارڈ کالج کولمبیا یونیورسٹی کی ایک طالبہ رابعہ بات کرنے کیلئے میرے ساتھ گئیں۔ ان کے کالج میں موجود پاکستانی کمیونٹی نے زلزلہ متاثرین کیلئے کافی رقم جمع کی تھی۔ ایشیا سوسائٹی کی سربراہی ایک بھارتی خاتون کر رہی تھیں۔ توقع کے مطابق آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ زیادہ تر لوگ بھارتی شہری تھی جو پاکستان کی عظیم ترین انسانی حقوق کی کارکن کو سننے آئے تھے۔ انہیں مایوسی نہیں ہوئی۔ لیکن میں مایوس تھی۔ لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ زلزلے کے بعد کوئی شخص ایک غیر ملکی پلیٹ فارم پر اپنی مسلح افواج کو تنقید کا نشانہ بنائے۔ چنانچہ میں نے سوال، جواب کے سیشن کے دوران عاصمہ سے سوال کیا کہ کیا ان کیلئے یہ زیادہ اہم نہیں تھا کہ وہ امریکہ آنے کی بجائے واپس ملک میں رہ کر لوگوں کی مدد کرتیں؟ انہوں نے مجھے ایک سیکنڈ میں خاموش کروا دیا۔ چنانچہ میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے جس انداز میں بات کی تھی اس سے حاضرین محظوظ ہوئے اور سب ہنسنے لگے۔

دو ماہ بعد جب میں اپنے سابق ایڈیٹر کے گھر ڈنر پر گئی اور وہاں میڈیا کے بہت سے سینئر لوگوں سے ملی۔ وہاں بھارتی صحافی کلدیپ نائر بھی موجود تھے۔ میں نے ان سے یہ واقعہ بیان کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنی کہانی ختم کر پاتی۔ ان میں سے ایک نے موبائل نکالا اور عاصمہ کا نمبر ڈائل کر کے ان سے فوری طور پر وہاں آنے کیلئے کہا۔ میڈیا کے باقی لوگوں اور میزبان خاتون کو بھی غصہ تھا کہ میں نے یہ بات کی ہی کیوں۔ میرے شوہر نے مجھ سے کہا کہ اب لوگ ہم سے اکتا چکے ہیں اور اب یہاں سے جانے کا وقت ہے۔ جب میں گھر واپس جا رہی تھی تو مجھے احساس ہوا کہ جو لوگ عاصمہ سے محبت رکھتے ہیں وہ ان کے متعلق کوئی تنقید برداشت نہیں کریں گے۔ اس بہادر خاتون کو وہ اس طریقے سے آئیڈیلائز کرتے تھے۔ لیکن یہاں میں ان سے سوال کرتی ہوں کہ وہ لوگ جو میڈیا میں شاندار ملازمتیں کر رہے ہیں اور شہزادوں جیسی تنخواہیں پا رہے ہیں کیا ان میں سے کوئی عاصمہ جہانگیر جیسا کردار ادا کر سکتا ہے جو انہوں نے کئی دہائیوں کے دوران برائی کی قوتوں کے خلاف ادا کیا تھا؟ کیا ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر تجزیے کرنے والے یہ لوگ سڑکوں پر نکل کر جیل جانے، مار کھانے یا قتل ہونے کا خطرہ مول لیں گے؟ آخر میں ان کاغذی اور ٹی وی شیروں سے میں پوچھوں گی کہ کیا ان میں اتنی طاقت ہے کہ وہ دائیں بازو کی مذہبی طاقتوں کا مقابلہ کریں؟

جب غیرت کے نام پر کوئی قتل ہوتا ہے یا جب کسی خاتون یا بچے سے زیادتی ہوتی ہے، یا طاقتور لوگوں کا کوئی گروہ کسی کی سرعام بے عزتی کرتا ہے تو کیا وہ اس پر آواز اٹھا سکتے ہیں؟ کیا ان میں اتنی جرات ہے کہ وہ آ کر متاثرہ فرد کا ساتھ دیں؟ عاصمہ ہمیشہ ان کی آواز بنتی تھیں۔ وہ کسی سے خوفزدہ نہیں تھیں۔ وہ اپنے راستے میں آنے والے کسی بھی شخص کو مسترد کرنے، ہرانے یا خاموش کرانے کی صلاحیت رکھتی تھیں اور میں نے بھی شرمندگی اٹھا کر یہ بات سمجھ لی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ایک صحافی کے طور پر یہ میرا حق تھا کہ میں ان سے ایسا سوال کروں جس سے وہ شاید اتفاق نہ کریں۔ میں نے ان کے کئی ٹی وی شوز دیکھے تھے جس میں وہ دوسرے مہمانوں کے ساتھ بحث میں الجھ جاتی تھیں۔ تو ان میں سے کون جیتتا تھا؟ بلاشبہ عاصمہ جہانگیر۔ ان کے اندر اتنی طاقت تھی کہ وہ اپنے دشمنوں کو پیچھے دھکیل سکیں۔ اور اسی وجہ سے وہ غیر معمولی شخصیت کی حامل تھیں۔

(19 فروری، 2018)

(روزنامہ مشرق)

# امید کی وراثت

وقار مصطفیٰ

وہ کبھی نا امید نہیں ہوئیں گو کہ کام ان کا ایسا تھا کہ قدم قدم پر مایوسیوں کا سامنا ہوتا تھا،منیزے جہانگیر نے یہ بات آنسو سمیٹتے ہوئے اپنی والدہ عاصمہ جہانگیر کے بارے میں کہی۔ بطور اینکر کے ٹیلی ویژن پر کہے۔ان کے الفاظ زیادہ اردو زبان سے تھے، بس ایک آدھ لفظ انگریزی کا تھا جس کا ترجمہ میں نے کر دیا۔انہی کے مطابق ان کی والدہ کا کہنا تھا کہ ہمارے لوگ، پاکستان کے لوگ ہیرے ہیں۔ انہیں تراشتا کوئی نہیں اور ریاست سے مدد نہ ملنے کے باوجود لڑ جھگڑ کر کچھ نہ کچھ بن ہی جاتے ہیں۔

عاصمہ جہانگیر کی وفات 11 فروری کو ہوئی۔غم کی جگہ اب ان کی یادیں منانے کا سلسلہ چلا ہے۔ عاصمہ متنازع ترین شخصیت بنیں کیونکہ وہ خواتین، اقلیتوں، سویلین بالادستی، آزادی اظہار کے حقوق کے لئے مذہبیت، قومیت اور پدرسری ثقافت کے بتوں سے ٹکرائیں۔ یوں یا تو انہوں نے محبت، تشکر اور تفاخر سمیٹے یا تلخی اور نفرت۔ایسے لوگوں کا مسئلہ یہی ہوتا ہے چونکہ وہ اکثر ان لوگوں کی غلط فہمیوں کا شکار ہوتے ہیں جو انہیں سرے سے جانتے نہیں اس لئے ان کے بارے میں ایسی باتیں اور خیالات رواج پاتے ہیں جن کا حقیقت سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ڈرنا تو خیر سیکھا ہی نہ تھا عاصمہ نے مگر منیزے ہی کے بقول وہ نڈر نہیں تھیں بلکہ انہوں نے ڈر پر قابو پا لیا تھا۔ نہ دھمکیوں سے مرعوب ہوئیں نہ حملوں سے۔ایک بار بلوچستان میں گاڑی پر حملہ ہوا تو کہنے لگیں کہ ان کی گولیاں ختم ہو جائیں گی مگر میرا جذبہ کم نہ ہوگا۔ستارہ امتیاز پایا، پاکستان بھر کے وکلا کی پہلی رہنما بنیں۔کس کس عالمی انعام کا نام لوں جو انہوں نے نہ جیتا ہو۔حال ہی میں لئے گئے ایک ایوارڈ کی رقم سے وہ ایسے ایف ایم چینلز قائم کرنا چاہتی تھیں جو انسانی حقوق کی تعلیم دے سکیں، ترویج کر سکیں مگر زندگی نے وفا نہ کی۔

27 جنوری1952 کو پیدا ہوئیں۔ لاہور کے جیزس اینڈ میری کانونٹ میں داخل ہوئیں۔یہیں پہلی مہم چلائی اور کامیاب رہیں کہ اسکول کی ہیڈ گرل کو نامزد نہ کیا جائے بلکہ جمہوری طریقہ سے چنا جائے۔13 سال کی عمر میں تشدد دیکھا جب انہیں ایک صحافی اور ایک سیاست دان جنہیں ان کے گھر کے باہر گولی لگی تھی، کو اسپتال لے کر جانا پڑا۔ان کے اپنے مطابق انہوں نے بچپن اور لڑکپن میں اپنے گھر میں گفتگو حقوق اور آزادیوں ہی کی سنی اور کہتی تھیں کہ ان کی والدہ تو والد ملک غلام جیلانی کی گرفتاریوں کی عادی ہو چکی تھیں۔ پہلا مظاہرہ 17 برس کی عمر میں ایوب حکومت کے خلاف کیا۔18 سال کی تھیں جب والد کی مارشل لا قوانین کے تحت گرفتاری کو لاہور ہائی کورٹ میں چیلنج کیا۔ 1972 میں انہی کی اپیل پر سپریم کورٹ نے یحییٰ خان کی حکومت کو اس کے خاتمہ کے بعد غیر آئینی اور یحییٰ خان کو غاصب قرار دیا۔1978 میں قانون کی ڈگری لی مگر اس سے کئی سال پہلے ہی مشرقی اور مغربی پاکستان کے سیاسی اور قانونی حلقوں میں نام بنا چکی تھیں۔

80 کی دہائی میں ویمن ایکشن فورم بنایا، ضیاالحق کے بنائے گئے خواتین کے حقوق کے خلاف بنائے گئے قوانین کے خلاف جدوجہد کی۔اس وقت جیل کی سلاخوں کے پیچھے خواتین میں سے آدھی وہ تھیں جو ضیا کے زنا آرڈیننس کا شکار ہو کر قید ہوئیں۔انہوں نے ایک 13 سالہ نابینا لڑکی کا کیس جیتا جو جبری زنا کا شکار بھی ہوئی اور جیل بھی اسی کو کاٹنا پڑی۔ صائمہ وحید کیس دیکھ لیں یا سمیعہ سرور کا،انہوں نے خواتین کے شادی اور طلاق میں مرضی کے حق کا بھی بھرپور دفاع کیا۔1983 میں جمہوریت کی بحالی کے لئے تحریک ایم آر ڈی میں شرکت پر گرفتار ہوئیں۔ ایک جانب ہیروئن، کلاشنکوف، اور فرقہ وارانہ اور نسلی تقسیم اور تشدد عام ہو رہے تھے مگر ان کے ذمہ دار، عاصمہ اور ان کے ساتھیوں کو مذہب مخالف، مغرب پرست اور غدار قرار دے رہے تھے۔

1986 میں اے جی ایچ ایس کے نام سے دیگر خواتین وکلا کے ساتھ مل کر لیگل ایڈ سنٹر بنایا، پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی بنا ڈالنے میں شریک ہوئیں اور 1987 میں اس ادارے کی سیکرٹری جنرل منتخب ہوئیں۔انہوں نے جداگانہ طریق انتخاب، مذہبی شناخت پر مبنی شناختی کارڈ اور مذہب کے غلط استعمال کے خلاف جدوجہد کی۔سلامت مسیح اور رحمت مسیح جنہیں غلط الزامات پر سزا سنائی گئی تھی، ان کا کیس لڑا۔ پندرہویں ترمیم کی مخالفت کی جس کا مقصد مذہبی ریاست کا قیام تھا۔2006 میں بلوچ لیڈر اکبر بگٹی کی ہلاکت سے دو روز پہلے ان سے ملنے کے لئے جانے والوں میں واحد غیر جانبدار شخصیت تھیں جنہیں ملنے کی اجازت دی گئی۔2007 میں ججوں کی بحالی کے لئے جدوجہد کی پاداش میں نظر بند ہوئیں۔خواتین کی لاہور میں میراتھن دوڑ منعقد کی، لاٹھی چارج کا شکار ہوئیں۔ انسانی حقوق کا دفاع کیا، بھارت کے کشمیریوں پر اور اسرائیل کے فلسطینیوں پر ظلم کے خلاف ایسی صدائے احتجاج بلند کی کہ مثال بنی۔جس شدومد سے انہوں نے کشمیر میں ہونے والے مظالم پر تنقید کی انہی کا خاصہ تھا۔مغرب کو بھی پاکستان میں جہاد کے نام پر تشدد کا برابر ذمہ دار قرار دیا۔یورپین یونین پارلیمنٹ میں پاکستان کو سفارتی اور اقتصادی طور پر تنہا کرنے کے خلاف یادگار دلائل دیئے۔ان کے اصول مستحکم بھی تھے اور ان میں تسلسل بھی تھا۔ ایک وقت میں جن کی معتوب ہوئیں ان ہی پر جب مشکل وقت آن پڑا تو ان کی وکیل بھی ہوئیں۔ان کی جدوجہد ملک کے کسی ایک خطے تک محدود نہیں تھی انہیں وطن اور وطن کے لوگوں سے بے پناہ محبت تھی، چاہے ان کا تعلق کسی بھی نظریہ سے ہو، کسی بھی مذہب سے ہو۔ان کی وراثت جرات ہے، امید ہے۔

(22 فروری، 2018)

(روزنامہ جنگ)

**27 جنوری1952** کو پیدا ہوئیں۔لاہور کے جیزس اینڈ میری کانونٹ میں داخل ہوئیں۔یہیں پہلی مہم چلائی اور کامیاب رہیں کہ اسکول کی ہیڈ گرل کو نامزد نہ کیا جائے بلکہ جمہوری طریقہ سے چنا جائے۔**13** سال کی عمر میں تشدد دیکھا جب انہیں ایک صحافی اور ایک سیاست دان جنہیں ان کے گھر کے باہر گولی لگی تھی، کو اسپتال لے کر جانا پڑا۔ان کے اپنے مطابق انہوں نے بچپن اور لڑکپن میں اپنے گھر میں گفتگو حقوق اور آزادیوں ہی کی سنی اور کہتی تھیں کہ ان کی والدہ تو والد ملک غلام جیلانی کی گرفتاریوں کی عادی ہو چکی تھیں۔ پہلا مظاہرہ **17** برس کی عمر میں ایوب حکومت کے خلاف کیا۔**18** سال کی تھیں جب والد کی مارشل لا قوانین کے تحت گرفتاری کو لاہور ہائی کورٹ میں چیلنج کیا۔ **1972** میں انہی کی اپیل پر سپریم کورٹ نے یحییٰ خان کی حکومت کو اس کے خاتمہ کے بعد غیر آئینی اور یحییٰ خان کو غاصب قرار دیا۔**1978** میں قانون کی ڈگری لی مگر اس سے کئی سال پہلے ہی مشرقی اور مغربی پاکستان کے سیاسی اور قانونی حلقوں میں نام بنا چکی تھیں۔

# یہ مزاحمت ختم نہیں ہوگی

حامد میر

اپنی ہنگامہ خیز زندگی کے آخری دن عاصمہ جہانگیر کچھ بجھی بجھی سی تھیں۔ اتوار کا دن تھا اور نواز شریف نے انہیں صبح گیارہ بجے جاتی امرا بلایا تھا تاکہ طلال چوہدری کے خلاف توہین عدالت کے مقدمے پر مشورہ کیا جاسکے۔ مسلم لیگ (ن) کو طلال چوہدری کے لئے کسی ایسے وکیل کی تلاش تھی جو سپریم کورٹ میں معافی مانگنے کے بجائے اپنے مؤکل کا دفاع کرے۔ کئی نامور وکیل طلال چوہدری سے واضح الفاظ میں کہہ چکے تھے کہ ان کے پاس معافی کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں لیکن نواز شریف کی ہدایت یہ تھی کہ معافی نہیں مانگنی۔ اسی لئے عاصمہ جہانگیر سے کہا گیا کہ وہ یہ مقدمہ لڑیں۔ 11 فروری کی صبح طبیعت کی خرابی کے باعث وہ جاتی امرا نہیں جاسکیں جس پر نواز شریف نے ایک وکیل کے ذریعے ان سے خود رابطہ قائم کیا اور طلال چوہدری کا وکیل بننے کی درخواست کی۔ طے پایا کہ شام چار بجے تک خواجہ سعد رفیق خود آ کر عاصمہ جہانگیر سے ملیں گے۔ اس گفتگو کے دوران عاصمہ جہانگیر کے دماغ کی شریان پھٹ گئی اور وہ بیہوش ہوگئیں۔ انہیں اسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ اپنے خالق حقیقی سے جاملیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ہائی بلڈ پریشر کے باعث انہیں برین ہیمرج ہوا۔ وہ پروین رحمان اور سبین محمود کی طرح غیر طبعی موت کا شکار نہیں ہوئیں بلکہ رضیہ بھٹی کی طرح بلڈ پریشر اور برین ہیمرج کا شکار ہوئیں۔ کئی لوگوں نے مجھے پوچھا کہ کیا عاصمہ جہانگیر کسی ذہنی دباؤ کا شکار تھیں؟ میں نے عرض کیا کہ ذہنی دباؤ کس پر نہیں ہے، کوئی اس کا ذکر کرتا ہے کوئی نہیں کرتا۔ عاصمہ پر ایک طرف کام کا دباؤ تھا دوسری طرف انہیں دھمکیوں کا سامنا رہتا تھا۔ وہ اکثر اوقات ان دھمکیوں کا ذکر نہیں کرتی تھیں تاکہ ان کے ساتھی اور خاندان کے افراد پریشان نہ ہوں۔ زندگی کے آخری دنوں میں نواز شریف کی نااہلی کے عدالتی فیصلے پر تنقید کے باعث عاصمہ جہانگیر کو بہت سے الزامات کا سامنا بھی کرنا پڑا اور اگر یہ بہادر خاتون طلال چوہدری کی وکیل بن کر سپریم کورٹ میں پیش ہوتیں تو یقیناً الزامات کی شدت میں اضافہ ہوتا۔ حقیقت یہ تھی کہ عاصمہ جہانگیر کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، البتہ نواز شریف کا موقف بدل گیا تھا۔ 2012ء میں میموگیٹ اسکینڈل کے شور شرابے میں کوئی وکیل حسین حقانی کے ساتھ کھڑا ہونے کو تیار نہ تھا۔ نواز شریف صاحب نے میموگیٹ اسکینڈل کی انکوائری کے لئے سپریم کورٹ میں درخواست دائر کی تھیں اور آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی اور آئی ایس آئی کے سربراہ احمد شجاع پاشا کو اپنا گواہ بنایا تھا۔

عاصمہ کو حسین حقانی سے کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ ان کا مؤقف تھا کہ نواز شریف کو سپریم کورٹ اور فوج کے ساتھ مل کر ایک منتخب حکومت کے خلاف سازش نہیں کرنی چاہئے۔ وہ چاہتی تھیں کہ حکومت انتخابات کے ذریعہ بدلنی چاہئے سپریم کورٹ کے ذریعہ نہیں بدلنی چاہئے لہٰذا وہ حسین حقانی کی وکیل بن گئیں۔ 2017ء میں سپریم کورٹ نے نواز شریف کی حکومت ختم کی تو عاصمہ اپنے پرانے مؤقف پر قائم تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت تبدیل کرنا ووٹروں کا کام ہے، سپریم کورٹ کا نہیں۔ اب نواز شریف ان کے ہم خیال ہو چکے تھے اور پیپلز پارٹی مخالف ہو چکی تھی۔ ہمارے بڑے بڑے سیاستدان وقت بدلنے کے ساتھ اپنا سیاسی مؤقف بھی بدل لیتے ہیں لیکن عاصمہ جہانگیر اپنے پرانے مؤقف پر ڈٹی رہتی تھیں۔ وہ آج کے تمام سیاستدانوں سے بڑی شخصیت تھیں۔ محترمہ بینظیر بھٹو نے اپنے دور حکومت میں انہیں ہائی کورٹ کا جج بنانے کی کوشش کی لیکن عاصمہ نے انکار کر دیا۔ 2013 میں عاصمہ کو پنجاب کی نگران وزارت اعلیٰ پیش ہوئی انہوں نے انکار کر دیا۔ موت سے کچھ دن پہلے ان کے سامنے نگران وزارت عظمیٰ کی بات رکھی گئی تو انہوں نے مسکرا کر رد کر دی۔ محترمہ فاطمہ جناح اور محترمہ بینظیر بھٹو کے بعد عاصمہ جہانگیر وہ تیسری خاتون ہیں جنہوں نے پاکستان کی سیاست و سماج پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ کچھ مہربان انہیں موت کے بعد بھی کفر کے فتوؤں سے نواز رہے ہیں۔ ان مہربانوں کو معلوم نہیں کہ عاصمہ جہانگیر کے والد ملک غلام جیلانی کی جماعت اسلامی کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے بڑی نیاز مندی تھی اور عاصمہ کا نکاح مولانا مودودی نے پڑھایا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ 2006 میں عاصمہ جہانگیر ڈیرہ بگٹی گئیں تو ان کی گاڑی پر فائرنگ کی گئی۔ واپس آ کر انہوں نے بانگ دہل کہا کہ اکبر بگٹی کو قتل کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ اس دعوے کے بعد عاصمہ پر ملک دشمنی کے الزامات لگائے گئے۔ کچھ ہی عرصے میں نواب اکبر بگٹی پراسرار موت کا شکار ہوگئے۔ ان کی موت کے بعد بلوچستان میں جو ہوا وہ نہ ہوتا اگر عاصمہ جہانگیر کی بات سن لی جاتی۔ عاصمہ جہانگیر نے ہمیشہ پاکستان اور پاکستان کے مظلوموں کا بھلا سوچا۔ وہ ایک بے لوث سماجی کارکن تھیں جو بغیر کسی غرض کے ہر مظلوم کی آواز بن جاتی تھیں اور پھر مسکرا کر ظالموں کی گالی گلوچ کا سامنا کرتیں۔

> مجھے یاد ہے کہ **2006** میں عاصمہ جہانگیر ڈیرہ بگٹی گئیں تو ان کی گاڑی پر فائرنگ کی گئی۔ واپس آ کر انہوں نے بہ بانگ دہل کہا کہ اکبر بگٹی کو قتل کرنے کی سازش کی جارہی ہے۔ اس دعوے کے بعد عاصمہ پر ملک دشمنی کے الزامات لگائے گئے۔ کچھ ہی عرصے میں نواب اکبر بگٹی پراسرار موت کا شکار ہوگئے۔

2016ء میں مری کے علاقے دیول میں ایک 19 سالہ لڑکی ماریہ صداقت کو زندہ جلا دیا گیا۔ پولیس نے اس واقعہ کو خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ علاقے کی عورتوں نے عاصمہ جہانگیر سے رابطہ کیا تو عاصمہ نے سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کا ایک فیکٹ فائنڈنگ مشن بنایا اور مجھے بھی اس میں شامل کر دیا۔ ایک دن میں، عاصمہ جہانگیر، کامران مرتضیٰ اور کچھ دیگر وکلا دیول کے پہاڑوں میں ماریہ صداقت کے گھر پہنچ گئے۔ اس کے والد نے ہمیں ماریہ کا آخری ویڈیو بیان سنایا جو موت سے کچھ لمحے قبل ایک ڈاکٹر نے پولیس کی موجودگی میں ریکارڈ کیا تھا۔ ماریہ نے علاقے کے کچھ بااثر لوگوں پر الزام لگایا کہ انہوں نے اس پر تیل چھڑک کر اسے جلا دیا تھا۔ ہم نے پولیس سمیت ملزمان کا مؤقف بھی معلوم کیا اور جب ماریہ کے لئے آواز اٹھائی تو ہم پر طرح طرح کے الزامات لگے۔ مجھ پر توہین رسالت کا بے بنیاد مقدمہ بنانے کی مذموم کوشش کی گئی اور مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ عاصمہ جہانگیر تو روزانہ اس صورتحال سے گزرتی ہیں۔ یہ واقعہ میری زندگی اور انداز فکر میں اہم تبدیلیوں کا باعث بنا اور میں نے زعم تقویٰ کے شکار کچھ بڑے بڑے پارساؤں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا۔ عاصمہ صرف مظلوم عورتوں کے لئے نہیں مظلوم مردوں کے لئے بھی آواز بلند کرتی تھیں۔ مزدور رہنما فاروق طارق نے ایک دفعہ لاہور میں جنرل پرویز مشرف کے ریفرنڈم کے خلاف مظاہرہ کیا اور گرفتار ہوگئے۔ انہوں نے عاصمہ سے مدد مانگی تو وہ ان کے لئے عدالت میں پیش ہوگئیں۔ ضمانت ہوگئی لیکن ضمانتی مچلکوں کے لئے مطلوبہ رقم یا جائیداد کے کاغذ نہ تھے۔ عاصمہ نے اپنے ذاتی گھر کی رجسٹری بطور ضمانت عدالت میں جمع کرائی اور فاروق طارق کو ان کے 18 ساتھیوں سمیت رہائی دلوائی۔ یہ وہ عورت تھی جس نے اسامہ بن لادن کے خاندان کی غیر قانونی حراست پر بھی احتجاج کیا اور ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی گرفتاری پر بھی احتجاج کیا۔ آئی اے رحمان صاحب نے بڑی خوبصورت بات لکھی ہے۔ لکھتے ہیں عاصمہ اپنے پیچھے امید کا اثاثہ چھوڑ گئی ہیں۔ میں کچھ دوستوں کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا کہ عاصمہ جہانگیر کا خلا پر نہیں ہوسکتا۔ آپ دیکھیں گے بہت جلد آپ کو عاصمہ جیسی ایک نہیں بلکہ کئی جرآتیں نظر آئیں گی۔ جہاں ظلم ختم نہ ہوگا، ہزاروں گمشدہ افراد واپس نہ آئیں گے اور غیرت کے نام پر قتل بند نہ ہوں گے وہاں عاصمہ جہانگیر کی مزاحمت بھی ختم نہیں ہوسکتی۔ یہ مزاحمت جاری رہے گی۔

(19 فروری، 2018)

(روزنامہ جنگ)

# عاصمہ جہانگیر ایک ہمہ گیر شخصیت

طلعت مسعود

عاصمہ جہانگیر اب تک پاکستانی تاریخ کی سب سے دلیر اور شاندار وکیل اور انسانی حقوق کی کارکن تھیں۔ وہ آئین اور قانون کی بالادستی پر بہت زیادہ یقین رکھتی تھیں جس سے انہیں اندرونی طاقت ملتی تھی۔ انہوں نے جب کبھی بھی ملک کے طاقتور ترین اداروں کو اپنی آئینی حدود سے باہر نکلتے اور سیاسی عمل کا گلا گھونٹتے ہوئے دیکھا تو وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں۔ عاصمہ نے آزاد عدلیہ، جنسی امتیاز کے خاتمے اور عوام کو اختیارات دینے کے حق میں بھرپور طریقے سے آواز اٹھائی۔ اپنے آخری دنوں تک وہ عدالت کی حد سے زیادہ کارروائیوں کی مخالفت کرتی رہیں کیونکہ انہیں اس بات کا شعور تھا کہ اس عمل کا مستقبل میں اداروں کی حدود پر سخت منفی اثر پڑے گا۔ اسی طرح انہوں نے مارشل لاء اور سویلین معاملات میں فوجی مداخلت کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ عاصمہ نے جنرل ضیاء کی آمرانہ پالیسیوں کے خلاف بھی دلیرانہ موقف اختیار کیا اور ضیاء کے غصے سے بالکل نہ گھبرائیں۔ جس بات نے انہیں طاقتور اداروں کے خلاف کھڑا ہونے کی طاقت دی تھی وہ یہ یقین تھا کہ صرف پاکستان کا جمہوری طور پر کامیاب ہونا ہی سب سے اہم بات ہے۔ غریبوں کے لیے ان کے دل میں خاص جگہ تھی۔ پاکستان میں چند ہی ایسے لوگ ہیں جو غریبوں کے ساتھ ان جیسی ہمدردی دکھائیں۔ عاصمہ نے پسے ہوئے طبقے کا قانونی دفاع کیا اور ان کے حقوق کی بات کی۔ وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو انہوں نے عالمی سطح پر بھی مظالم کا نشانہ بننے والوں کے لیے آواز بلند کی۔ وہ فلسطین کا مقدمہ لڑنے والوں میں پیش پیش تھیں۔ انہوں نے عراق پر امریکی حملے کی مخالفت کی اور روہنگیا مسلمانوں پر مظالم کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ ان کی آواز میں اس لیے دم تھا کیونکہ وہ بے لوث ہو کر مظلوموں کے حق میں بھرپور طریقے سے آواز اٹھائی۔ اپنے آخری دنوں تک وہ عدالت کی حد سے زیادہ کارروائیوں کی مخالفت کرتی رہیں کیونکہ انہیں اس بات کا شعور تھا کہ اس عمل کا مستقبل میں اداروں کی حدود پر سخت منفی اثر پڑے گا۔ اسی طرح انہوں نے مارشل لاء اور سویلین معاملات میں فوجی مداخلت کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ عاصمہ نے جنرل ضیاء کی آمرانہ پالیسیوں کے خلاف بھی دلیرانہ موقف اختیار کیا اور ضیاء کے غصے سے بالکل نہ گھبرائیں۔ جس بات نے انہیں طاقتور اداروں کے خلاف کھڑا ہونے کی طاقت دی تھی وہ یہ یقین تھا کہ صرف پاکستان کا جمہوری طور پر کامیاب ہونا ہی سب سے اہم بات ہے۔ غریبوں کے لیے ان کے دل میں خاص جگہ تھی۔ پاکستان میں چند ہی ایسے لوگ ہیں جو غریبوں کے ساتھ ان جیسی ہمدردی دکھائیں۔ عاصمہ نے پسے ہوئے طبقے کا قانونی دفاع کیا اور ان کے حقوق کی بات کی۔ وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو انہوں نے عالمی سطح پر بھی مظالم کا نشانہ بننے والوں کے لیے آواز بلند کی۔ وہ فلسطین کا مقدمہ لڑنے والوں میں پیش پیش تھیں۔ انہوں نے عراق پر امریکی حملے کی مخالفت کی اور روہنگیا مسلمانوں پر مظالم کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ ان کی آواز میں اس لیے دم تھا کیونکہ وہ بے لوث ہو کر مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کے خلاف آواز بلند کرتی تھیں۔ اور معمول کے مطابق ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا کہ انہیں اپنے ملک سے زیادہ بیرون ملک پذیرائی ملی۔ ان کی صلاحیتوں اور بچوں کے حقوق سے وابستگی کے اعتراف میں انہیں 1986 میں ڈیفنس فار چلڈرن انٹرنیشنل کی نائب چیئر پرسن مقرر کیا گیا۔ وہ اس ادارے کی دو برس تک خدمت کرتی رہیں۔ انہوں نے 1993ء میں ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی بنیاد رکھی اور اس کی چیئر پرسن بن گئیں۔ عاصمہ کو کبھی بھی جیل جانے یا نظر بندی سے ڈر نہیں لگا۔ انہیں جنرل ضیاء کے دور میں تحریک بحالی جمہوریت کے دوران K گرفتار بھی کیا گیا۔ وہ وکلاء تحریک کی مرکزی رہنما بھی تھیں اور سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی پہلی خاتون سربراہ بھی بنیں۔ میں نے ایک دوست کی حیثیت میں بار الیکشن لڑنے کے دوران ان کی قوت کا مظاہرہ خود دیکھا۔

انہوں نے اقلیتوں کے لیے جو آواز اٹھائی اس سے ظاہر ہے کہ انہیں نظر انداز کیے گئے طبقے کا کتنا خیال تھا۔ وہ توہین مذہب کے الزامات کا شکار ہونے والے مسیحوں کے مقدمات کا دفاع کرتی تھیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے انہیں مخصوص مذہبی گروپوں کے غصے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عاصمہ کو فرانس کا اعلیٰ ترین سویلین ایوارڈ بھی دیا گیا جو نوبل انعام کے قریب تر سمجھا جاتا ہے۔ فرانسیسی سفیر نے ان کے اعزاز میں ان کی رہائش گاہ پر ایک تقریب منعقد کی۔ عاصمہ نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس تقریب سے خطاب کروں۔ یہ میرے لئے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ مجھے اب بھی ان کی شاندار تقریر یاد ہے جو اپنے معنی و مطلب کے لحاظ سے بہت گہری تھی۔ اس لیے یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ بہت کم پاکستانی سماجی کارکن ایسے ہیں جنہیں عاصمہ جیسی شہرت اور عزت نصیب ہوئی ہے۔ وہ بینظیر بھٹو کے بہت قریب تھیں اور ان کا اعتماد بھی جیت چکی تھیں۔ لیکن جب کبھی وہ بینظیر کی کسی پالیسی سے اتفاق نہیں کرتی تھیں تو وہ انہیں بھی تنقید کا نشانہ بناتی تھیں۔ عاصمہ مسلم لیگ ن کی قیادت کو مشورہ دینے میں بھی نہیں ہچکچاتی تھیں۔ جمہوریت کی مداح ہونے کے ناطے ان کی خواہش تھی کہ سویلین حکومتیں اپنی مدت پوری کریں۔ تاہم اس کے باوجود حکومتی ناکامیوں کے خلاف آواز اٹھانے سے نہیں چوکتی تھیں۔ عاصمہ کو یقین تھا کہ انسانی حقوق ہی ریاست کی بنیاد ہوتے ہیں اور بین الریاستی تعلقات میں بھی ایک اہم عنصر ہوتے ہیں۔ انہیں پورا یقین تھا کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والی کوئی ریاست زیادہ دیر پرامن نہیں رہ سکتی نہ ہی اسے عالمی سطح پر کوئی عزت ملے گی۔ قصہ مختصر کہ انسانی حقوق کو یقینی بنانے کے لیے انسانی حقوق کی پاسداری ضروری ہے۔ انہوں نے ہمسائیوں کے ساتھ اچھے تعلقات کے فروغ کی بھی حمایت کی۔ اس کے ساتھ وہ ان ممالک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی ناقد بھی رہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ عاصمہ کے اسٹیبلشمنٹ اور خاص طور پر فوجی قیادت سے تعلقات انتہائی خراب رہے۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ ریاست کی جن اندرونی و بیرونی پالیسیوں میں فوج کا بہت زیادہ دخل تھا ان پر عاصمہ کی تنقید کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ فوج اور سول فورسز کی دہشت گردی کے خلاف کامیابیوں کی معترف نہیں تھیں۔ حال ہی میں وہ اداروں کے درمیان مذاکرات پر زور دے رہی تھیں۔ اپنی گہری نظر کی وجہ سے وہ سمجھتی تھیں کہ یہ اہم ہے کہ ادارے مل کر قومی چیلنجز کا مقابلہ کریں۔ پاکستان کو درپیش چیلنجز کا افسوسناک پہلو اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ہر فرد اور ہر ادارے کے پاس یہ حق ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرے لیکن یہ کام آئین اور قانون کے دائرے میں ہونا چاہیے۔ ورنہ جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا ہے، ہم سب مختلف سمتوں میں زور لگاتے رہیں گے اور ریاست کی قوت تباہ ہو جائے گی۔ عاصمہ ایک شاندار پیشہ ور وکیل تھیں اور انہوں نے کبھی سیاست کو عدالتوں کے ساتھ گڈمڈ نہیں ہونے دیا۔ عاصمہ کا آئیڈیلزم اور ان تھک کوششیں یقیناً بہت سے لوگوں کو متاثر کریں گی۔ حقیقت پسندی، ہمدردی اور انسانی حقوق کی پاسداری ان کی میراث ہے جو پاکستان کے لیے آنے والے وقتوں میں مشعل راہ ہوگی۔

(15 فروری، 2018)

(روزنامہ مشرق)

> پاکستان میں چند ہی ایسے لوگ ہیں جو غریبوں کے ساتھ ان جیسی ہمدردی دکھائیں۔ عاصمہ نے پسے ہوئے طبقے کا قانونی دفاع کیا اور ان کے حقوق کی بات کی۔ وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو انہوں نے عالمی سطح پر بھی مظالم کا نشانہ بننے والوں کے لیے آواز بلند کی۔ وہ فلسطین کا مقدمہ لڑنے والوں میں پیش پیش تھیں۔ انہوں نے عراق پر امریکی حملے کی مخالفت کی اور روہنگیا مسلمانوں پر مظالم کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ ان کی آواز میں اس لیے دم تھا کیونکہ وہ بے لوث ہو کر مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کے خلاف آواز بلند کرتی تھیں۔ اور معمول کے مطابق ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا کہ انہیں اپنے ملک سے زیادہ بیرون ملک پذیرائی ملی۔ ان کی صلاحیتوں اور بچوں کے حقوق سے وابستگی کے اعتراف میں انہیں 1986 میں ڈیفنس فار چلڈرن انٹرنیشنل کی نائب چیئر پرسن مقرر کیا گیا۔ وہ اس ادارے کی دو برس تک خدمت کرتی رہیں۔

# انسانی حقوق کی نگہبان۔عاصمہ جہانگیر

منور علی شاہد

مرتے وہ لوگ ہیں جو صرف اپنے لئے جیتے ہیں لیکن جو دوسروں کے لئے جیتے ہیں وہ کبھی مرا نہیں کرتے۔ایسے لوگ مر کر بھی امر ہو جاتے ہیں۔عاصمہ جہانگیر بھی صرف دوسروں ہی کے لئے جیتی تھی لہذا وہ کبھی مر نہیں سکتی، وہ زندہ رہے گی۔لوگ اس کو زندہ رکھیں گے اسی طرح جیسے آج امریکہ میں مارٹن لوتھر جونیئر شہریوں کے یکساں حقوق کی تحریک کا سرگرم رہنما، نسلی تفریق اور امتیاز کے خلاف شہری نافرمانی کی تحریک چلانے والا زندہ ہے۔

عاصمہ جہانگیر بھی زندہ رہے گی اسی طرح جس طرح آج نیلسن منڈیلا زندہ ہے۔بیسویں صدی کے آخری عشروں میں لبرل ازم کی عالمی علامت، نسلی امتیاز کے خلاف کامیاب جدوجہد کرنے والا نیلسن منڈیلا جس کو دنیا نے زندہ رکھا ہوا ہے۔مولانا رومی کا ایک بہت مشہور قول ہے کہ خدا تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہیں لیکن میں نے خدا کا پسندیدہ ترین راستہ مخلوق سے محبت کو چنا ہے۔ جو لوگ عاصمہ کو جانتے ہیں وہ بخوبی واقف ہیں کہ عاصمہ کا بھی یہی راستہ تھا وہ بھی خدا کی مخلوق سے محبت کرتی تھی۔ بلا امتیاز رنگ ونسل، مذہب وعقیدہ سبھی کو انسان سمجھتی تھی اور تمام زندگی انہی کے حقوق کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کا ممبر ہونے کی حیثیت سے میرا عاصمہ جہانگیر سے براہ راست تعلق ایک دہائی سے زیادہ عرصہ پر محیط رہا ہے۔سینکڑوں بار ان سے انفرادی واجتماعی ملاقاتیں ہوئیں، دلائل اور سچ پر مبنی ان کی باتوں کو سنا، ہر بار ایک نئی بات سمجھی اور سیکھی۔گارڈن ٹاؤن لاہور میں واقع ایچ آر سی پی کے نیشنل سیکریٹریٹ میں ہونے والی تقریبات میں ان کو ملنے اور سننے کے مواقع ملتے تھے۔جس وقت عاصمہ جہانگیر وہاں موجود ہوتی تھیں اس وقت اندر کا ماحول اور گہما گہمی کا اپنا ہی رنگ ہوا کرتا تھا۔ قدآور مردوں اور دراز قد عورتوں کے درمیان ایک دبلی پتلی سی خاتون کی اپنی ایک الگ منفرد شان ہوا کرتی تھی۔ ہر طبقہ کے مرد وزن کا ہجوم ان کو گھیرے میں لئے ہوتا تھا۔جب کبھی الگ ملاقات ہوتی تو مسکراتے ہوئے پوچھتی تھیں کہ کیا خبریں ہیں۔تو میں ان کو تازہ خبریں سنا دیتا تھا۔ ہر سال مارچ، اپریل کے ماہ منعقد ہونے والی سالانہ تقریب میں مجھے بولنے کا ضرور موقع دیا کرتی تھیں۔

پاکستان کی تاریخ کے طالب علموں اور محققین کی تحقیق اس وقت تک نامکمل اور ادھوری رہے گی جب تک وہ عاصمہ جہانگیر کا تذکرہ نہیں کریں گے۔ عاصمہ جہانگیر انسانی حقوق کے افق پر چمکتا ہوا وہ روشن ستارہ تھیں جن کی روشنی سے ہر انسان منور ہوا تھا خواہ اس کا عقیدہ کچھ بھی ہو۔اور وہ کہیں بھی رہتا ہو۔ پاکستان ایسے قدامت پسند معاشرے میں جہاں ملّا، ملائیت اور غیر جمہوری طاقتوں کا غلبہ ہو، وہاں ایک عورت ہونے کے باوجود بہادری، دلیری، جرات اور استقامت کے ساتھ سب دھمکیوں اور فتوؤں کو پاؤں تلے روندتے ہوئے طبعی موت پانا غیر معمولی بات ہے۔جن موضوعات پر مرد اور ادارے بولنے سے ہچکچاتے اور گھبراتے تھے، ان کے بارے میں عاصمہ بے خوف وخطر اور دھڑلے سے بات کرتی تھیں۔کسی ڈکٹیٹر کا دور ہو یا سول حکومت کا، جب بھی کبھی ایسا فیصلہ ہوا جو انسانی حقوق، جمہوریت اور قانون کے منافی تھا، ہر موقع پر انہوں نے قانون کی بالادستی، مساوات، اور انسانی حقوق کی پاسداری کے لئے اپنی آواز سب سے پہلے بلند کی۔ ایک ایسی سوسائٹی جہاں مذہبی ٹھیکیداروں نے انسان کی شناخت مذہب وفرقہ قرار دے ہو، وہاں انہوں نے خطبہ حجتہ الوداع میں بیان کردہ انسانی برابری اور مساوات کا علم بلند کئے رکھا اور جس

مولانا رومی کا ایک بہت مشہور قول ہے کہ خدا تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہیں لیکن میں نے خدا کا پسندیدہ ترین راستہ مخلوق سے محبت کو چنا ہے۔ جو لوگ عاصمہ کو جانتے ہیں وہ بخوبی واقف ہیں کہ عاصمہ کا بھی یہی راستہ تھا وہ بھی خدا کی مخلوق سے محبت کرتی تھی۔ بلا امتیاز رنگ ونسل، مذہب وعقیدہ سبھی کو انسان سمجھتی تھی اور تمام زندگی انہی کے حقوق کے لئے وقف کر رکھی تھی۔

کے نتیجہ میں وہ مختلف ممالک اور طبقوں کی ایجنٹ بھی قرار دی گئیں۔

عاصمہ جہانگیر اور گلگت کا احسان علی

عاصمہ جہانگیر نے نہ صرف پاکستان اور ایشیا میں عورتوں کے حقوق کے لئے غیر معمولی خدمات سرانجام دیں بلکہ عالمی سطح پر بھی پاکستان کا نام روشن کیا۔ملکی سیاست میں جبر کے خلاف مزاحمت کی بنیاد رکھی۔ پرویز مشرف نے اقتدار سنبھالا تو بغل میں دو کتوں کو دبائے اتاترک بننے کے گھمنڈ میں نئی روشن خیالی کو متعارف کرایا تھا۔مئی 2005ء میں خواتین پر تشدد کے خلاف نکالی جانے والی مخلوط میراتھن ریس پر مذہبی جماعتوں کے مطالبہ پر حکومت کی طرف سے پابندی لگا دی گئی تھی اور یہ دور بھی پرویز مشرف ہی کا تھا میں خود بھی وہاں موجود تھا۔ دنیا نے دیکھا کہ عاصمہ نے تمام تر رکاوٹوں کے باوجود سڑک پر دوڑ لگائی اور بعد ازاں دیگر خواتین سمیت پولیس کے تشدد کا نشانہ بنی تھیں۔ جن گروہوں کے آگے پرویز مشرف نے گھٹنے ٹیکے ہوئے تھے ان کے سامنے عاصمہ جہانگیر اکیلی سیسہ پلائی دیوار بنی رہی تھیں نیوز چینلز کے ریکارڈ گواہی دیں گے کہ حساس ترین سیاسی موضوعات پر لائیو گفتگو کے دوران ان کا انداز گفتگو بہت پر تحمل اور شائستہ ہوا کرتا تھا جبکہ ان کے مقابل دیگر کے منہ سے جھاگ نکل رہی ہوتی تھی جس سے ان کی کمزوری کا پتہ چلتا تھا۔

عاصمہ جہانگیر صرف انسانی حقوق ہی کی نگہبان نہ تھیں بلکہ وہ امن کی بھی علامت بھی تھیں۔کئی سال تک مال روڈ پر یکم جنوری کو مال روڈ پر امن مارچ کرنا، واہگہ بارڈر پر جا کر امن کی شمعیں روشن کرنا ان کی امن محبت کی روشن مثالیں ہیں۔

پریس کلب لاہور کی تاریخ گواہ رہے گی کہ کیسے اس نے باہمت خاتون کو دھاڑتے ہوئے سنا، اور انسان دشمن نظریات کا پرچار کرنے والوں کو للکارتے دیکھا تھا۔عاصمہ جہانگیر کی انسانی حقوق کی خدمت کا سب سے بڑا کارنامہ لاہور میں 1986ء میں ایک آزاد اور خود مختار کمیشن کا قیام ہے جس کو آج پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے نام سے پکارا جاتا ہے۔آج اس کا یہ مقام ہے کہ اقوام متحدہ اور ایمنسٹی انٹرنیشنل سمیت دیگر عالمی ادارے اور حکومتیں ایچ آر سی پی کی ہی رپورٹس پر یقین رکھتی ہیں۔اسی ادارے کے توسط سے انسانی حقوق کی صورتحال پر نظر رکھتی ہیں۔آپ کو اس ادارہ کے شریک بانیوں کا اعزاز حاصل ہے تاہم سچ یہی ہے کہ اس ادارے کو بام عروج پر لے جانے میں عاصمہ جہانگیر کا اہم کردار اور بے مثال جدوجہد شامل ہے۔ عاصمہ جہانگیر کا دوٹوک موقف تھا کہ مذہب اور عقیدے کی بنیاد پر ریاست وحکومت کو کسی شہری سے امتیازی سلوک کرنے کا حق نہیں اور یہی وہ اصولی موقف تھا جس کی وجہ سے ملک کے رجعت پسند ان کے جانی دشمن ہو چکے تھے۔ عاصمہ جہانگیر کی انسانی حقوق کی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے ان میں بے گھر عورتوں کے لئے شیلٹر ہومز کا قیام، بھٹہ مزدوروں کے مسائل کے حل کے لئے ایک طویل قانونی جنگ اور پھر جبری مشقت کی ہر قسم کی پابندی لگوانا۔اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کے حقوق کے لئے بہت سے اقدامات کئے۔

عاصمہ جہانگیر کو انسانی حقوق کی دیگر عالمی شخصیات کی طرح پابند سلاسل بھی ہونا پڑا اور متعدد بار نظر بندی کا سامنا رہا۔عاصمہ جہانگیر نے انسانی حقوق کے تحفظ اور پاسداری میں کبھی بھی امتیاز نہ برتا تھا اس کا ثبوت امریکہ میں لاپتہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا معاملہ تھا۔ سب سے پہلے عاصمہ ہی نے اس کو اٹھایا تھا۔عاصمہ جہانگیر نے پاکستان کے نام اور وقار کو دنیا میں بلند کئے رکھا۔دنیا کے جس کونے میں بھی جاتیں وہاں پاکستانی عاصمہ جہانگیر کے حوالے سے ذکر ہوتا۔

آج عاصمہ جہانگیر ان پاکستانی شخصیات میں شامل ہو گئی ہیں جن کو بیرون ملک پاکستان کا نام بلند کرنے کی پاداش میں نفرت، تعصب کا مرتے دم تک سامنا رہا تھا۔عاصمہ جہانگیر کا نام انسانی حقوق کی جدوجہد اور ان کا دفاع کرنے والوں کی فہرست میں سرفہرست لکھا جائے گا خواہ اس کا تعلق پاکستان، ایشیا یا اقوام عالم سے ہو۔

(18فروری،2018)

(البیان پاکستان)

# عاصمہ جہانگیر: بس یادیں رہ جاتی ہیں

شاہد ملک

پورا جملہ تھا 'بس شاہ جی، یادیں رہ جاتی ہیں'۔ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھتے ہی یہ الفاظ روزنامہ 'ڈان' کے ایڈیٹر ظفر عباس کے منہ سے نکلے جو عام حالات میں یار باش مگر غیر جذباتی آدمی ہیں۔

انقلابی ذہن کے لوگ کہیں گے کہ قذافی اسٹیڈیم لاہور کے باہر یہ مکالمہ اِس لئے ہوا کہ عاصمہ جہانگیر کی نمازِ جنازہ کے لئے مرد وزن ساتھ ساتھ کھڑے ہو کر کچھ ہی دیر میں ایک نئی روایت کو جنم دینے والے تھے۔ شاعرانہ مزاج والے اِس کے پیچھے کوئی خوشگوار زمانی حوالہ بھی تلاش کر سکتے ہیں کیونکہ جب چار سال کے وقفہ سے ظفر اور مَیں بغل گیر ہوئے تو 'ویلنٹائن ڈے' میں محض نو گھنٹے باقی تھے۔ یوں تو دونوں ہی نکتے قابلِ غور ہیں، لیکن میرے بی بی سی کے پرانے ہم کار ظفر عباس کا اشارہ کسی اور طرف تھا۔ یہی قذافی اسٹیڈیم، ہر عمر اور طبقہ کے شرکا، اور عنفوانِ بہار موسم۔ تو ابتدا کرتے ہیں اِسی کہانی سے۔ پہلے یہ وضاحت کہ 'شاہ جی' ہم میں سے کسی کا نام نہیں۔ محض قریبی دوستوں کو بُلانے کا ایک انداز ہے، جو پہلے پہل نامور افسانہ نگار مرزا حامد بیگ سے سیکھا تھا۔ اِسے لہجہ کی شاعری سمجھ لیں، بالکل یوں جیسے سندھ میں عزت افزائی کے لئے ایک دوسرے کو 'سائیں'، خیبر پختونخوا کے نواحی علاقوں میں 'خان جی'، پوٹھوار میں 'راجہ' اور میرے آبائی ضلع میں 'چودھری صاحب' کہہ کر بلا لیا جائے تو اِسے کوئی اور علامت نہیں بلکہ میجر، کرنل اور پروفیسر کے نمونہ پر ایک 'رینک' خیال کیا جائے گا۔ شرط یہ ہے کہ آپ کا رشتہ اپنے دوست سے بے تکلفی کا ہو۔ جیسے لندن میں ہمارے سینئر ساتھی سید اطہر علی نے منصور معجز کو ہمیشہ 'ڈاکٹر' کہا مگر جب شفیع نقی جامعی نے ایسا کرنا چاہا تو سختی سے ممانعت کر دی۔ اسی طرح یہ بھی کبھی نہ ہوا کہ حاجی ثقلین امام نے اپنے مخاطب کو انہی کے انداز میں پلٹ کر 'حاجی اعجاز رضوی' کہہ دیا ہو۔ پر، جناب، رواں صدی کے آغاز کی جو کہانی بیان کرنے کا ارادہ ہے، ظفر عباس یا شاہد ملک تو فقط اُس کے ضمنی کردار ہیں، جو جنوری 2006ء کی ایک صبح رپورٹنگ کی خاطر قذافی اسٹیڈیم پہنچے۔ وگرنہ خبر کا عنوان تو اُس دن بھی عاصمہ جہانگیر تھیں جن کی مثالی جرات نے پیشہ ور اتھلیٹوں کے ہمراہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی شرکت کو یقینی بنا کر میراتھان دوڑ کو ایک عوامی جشن میں تبدیل کر دیا۔ میری اگلی بات سُن کر خدا معلوم آپ کون سے احساس کمتری کا لیبل لگانا چاہیں، لیکن میراتھان کی تصویر کو نمازِ جنازہ کے فریم میں سجا کر دیکھوں تو دونوں تقاریب ذاتی طور پر میرے لئے ایک ہی نوعیت کے تجربات تھے۔ ایک سا جوش و خروش، ایک سی رنگا رنگی اور وہی پر ہجوم ٹریفک جس سے بچنے کے لئے دونوں بار گھر سے اسٹیڈیم تک کی چار کلومیٹر پیدل مسافت میرے لئے کشادہ تر گلی زمینوں کا سفر بن گئی۔

میراتھان میں عاصمہ جہانگیر کا کردار یوں اہم ہے کہ بعض مذہبی جماعتیں دوڑ کو زبردستی رکوانے کے لئے ایک دن پہلے مار کٹائی کے ذریعہ طاقت کا مظاہرہ کر چکی تھیں۔ ملاحظہ ہو بی بی سی رپورٹ کی ایک جھلک ''لاہور کا قذافی اسٹیڈیم جہاں میراتھان دوڑ کے لئے تین الگ الگ مقابلوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ خاص توجہ کا ایک مقابلہ خصوصی افراد کی دوڑ تھی، جنہوں نے وہیل چیئرز پر سوار ہو کر میراتھان میں شمولیت اختیار کی۔ مذہبی جماعتوں کی اِس دھمکی کے بعد کہ وہ دوڑ میں خواتین کی شرکت کو غیر اسلامی سمجھتے ہوئے اِس کے خلاف احتجاج کریں گی، منتظمین پانچ کلومیٹر کے مقابلوں کے بارے میں تشویش کا شکار رہے کیونکہ خواتین اور بچوں کی بڑے پیمانے پر شرکت کا امکان اسی دوڑ میں تھا۔ عملاً اِس مقابلے میں خواتین کی شرکت کا تناسب توقع سے کہیں کم رہا۔''

زمانی ترتیب کی رو سے دیکھیں تو یہ عاصمہ جہانگیر کی زندگی کے آخری ابواب ہیں۔ پہلی مرتبہ اخبارات میں اُن کے والد ملک غلام جیلانی کے اسمِ گرامی سے آشنائی **1960**ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں ہوئی تھی جب مَیں نیا نیا ہائی اسکول میں داخل ہوا۔ 'نوائے وقت' کے صفحہ اول پر اِس مفہوم کی شہ سرخی یاد پڑتی ہے کہ ملک غلام جیلانی کی کوٹھی کے احاطہ میں صحافی ضمیر قریشی کو گولی مار دی گئی۔ اخبار نے یہ اطلاع بھی دی کہ حملہ کا اصل ہدف مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن میر عبدالباقی بلوچ تھے، جو اِس کارروائی میں زخمی تو ہوئے مگر زندہ بچ گئے۔ تب اِس نوعیت کے واقعات خال خال ہوا کرتے تھے، لہٰذا وقتی طور پہ یوں لگا کہ مذکورہ واردات نے ملک کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ میر باقی بلوچ کون ہیں؟ اُن پہ حملہ کیوں ہوا؟ ضمیر قریشی اِس کی زد میں کیسے آ گئے؟ یہ باتیں ہماری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ باتیں اُس وقت سمجھ میں آنے لگیں جب سپریم کورٹ آف پاکستان کے پانچ رکنی بینچ نے چیف جسٹس حمود الرحمان کی سربراہی میں وہ فیصلہ سنایا جسے وطنِ عزیز کی عدالتی تاریخ میں عاصمہ جیلانی کیس کے نام سے دائمی شہرت ملنے والی تھی۔

یہ فیصلہ اُن دو پٹیشنوں کے ضمن میں ہوا جن میں ملک غلام جیلانی کی بیٹی عاصمہ جیلانی اور الطاف گوہر کی اہلیہ زرینہ گوہر نے اپنے والد اور شوہر کی نظر بندی کو لاہور ہائی کورٹ اور سندھ و بلوچستان ہائی کورٹ میں الگ الگ چیلنج کیا تھا۔

چونکہ اُس مرحلہ تک ملکی حالات پر جنرل یحییٰ خان کا فوجی اقتدار سایہ فگن تھا، اِس لئے ہائی کورٹ نے کہا کہ دونوں کے خلاف کارروائی چونکہ مارشل لا کے حکم کے تحت ہوئی، چنانچہ عدالت عالیہ یہ مقدمہ سننے کی مجاز نہیں۔ خیر، سپریم کورٹ نے بہت کچھ بدل کے رکھ دیا اور بالآخر ذوالفقار علی بھٹو کو سویلین مارشل لا کی بساط بھی لپیٹنا پڑی۔ اِس خیال سے کہ کئی اہم مگر غیر معروف واقعات قوم کے اجتماعی حافظہ کا حصہ بنے رہیں، یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ الطاف گوہر، جو فیلڈ مارشل ایوب خان کے عہدِ اقتدار میں سیکرٹری اطلاعات کے طور پر اثر و رسوخ کے مالک رہے، اپنے حراست میں لئے جانے کے وقت روزنامہ 'ڈان' کے ایڈیٹر تھے۔ نئے صدر ذوالفقار علی بھٹو کے پریس سیکرٹری خالد حسن نے صدر کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ الطاف گوہر کے خلاف اقدام سے پیپلز پارٹی کی حکومت اور پریس کے باہمی تعلقات پر منفی اثر پڑے گا۔ بھٹو صاحب کا ردِعمل مثبت نہیں تھا۔ چنانچہ خالد حسن نے زبانی گفتگو کے بعد ایک تحریری نوٹ صدر کو بھجوایا جس میں یہی دلائل دہرائے۔ اِس پر خالد کے بقول، بھٹو مرحوم نے اپنے اسپیشل اسسٹنٹ رفیع رضا سے کہا کہ خالد حسن زیادہ عرصہ چل نہیں سکے گا، وہ میرے فیصلوں کو چیلنج کرتا ہے۔

رواں صدی شروع ہونے سے پہلے لندن سے لاہور آ جانے پر بی بی سی کے نامہ نگار کی حیثیت سے میری ملاقاتیں اپنے اپنے شعبوں کی جن سرکردہ شخصیات سے رہیں، اُن میں عاصمہ جہانگیر بہت نمایاں ہیں۔ پھر بھی 'شاہ جی' قسم کے چند ایک دوستوں کو چھوڑ کر اکثر عدالتی، سیاسی اور انتظامی شخصیات سے میرے رشتہ کی طرح یہ تعلق بھی پیشہ ورانہ نوعیت کا تھا۔

چند موقعوں پر باضابطہ دعوت موصول ہونے کے باوجود اُن کے گھر جانے کا اتفاق بس ایک مرتبہ ہوا، وہ بھی خبر کے سلسلے میں۔ اُن کے مین بلیوارڈ والے دفتر میں چائے کئی بار پی ہوگی، کھانا ایک ہی دفعہ کھایا۔ وہ بھی ایک انٹرویو نے طول کھینچ لیا تھا۔ عاصمہ صاحبہ نے اپنے لئے بازار سے قیمہ آلو کی پلیٹ منگوائی اور ساتھ سلاد لانے کے لئے کہا۔ مجھ سے پوچھا تو مَیں نے بھی 'ہاں' کر دی اور اُن کی مہمان نوازی کا سادہ قرینہ پسند آیا۔

فوجداری وکلا جیسی جرح کے عادی بعض دوست جاننا چاہیں گے کہ بطور صحافی مجھے مرحومہ تک کتنی رسائی حاصل تھی۔ عرض کروں گا کہ انسانی حقوق کے مسائل ہوں، سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی صدارت ہو یا کسی اہم مقدمہ کی سماعت، ہمارا ہر مرحلہ پہ بارہا ساتھ رہا اور اِس میں نازک مقامات بھی آئے، لیکن خبر کے لئے درکار معلومات حاصل کرنے میں کبھی کوئی باہمی رکاوٹ نہیں ہوئی۔

یہاں تک کہ اپریل 1999ء میں جب اے جی ایچ ایس کے دفتر میں 29 سالہ سمیعہ سرور کو غیرت کے نام پہ گولی مار دی گئی تو اِس ہولناک منظر کو دیکھنے والا اولین رپورٹر مَیں ہی تھا۔

البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اُس شام، اُس سے پہلے یا بعد، میری طرف سے نشر ہونے والی کسی خبر کے ضمن میں عاصمہ جہانگیر نے مجھ پر اثر انداز ہونے کی کوشش کبھی نہ کی۔ وہ زندہ ہوتیں تو مَیں اِس پر اُن کا شکریہ ادا کرتا، مگر کیا کریں، شاہ جی، بس یادیں رہ جاتی ہیں۔

(18 فروری، 2018)

(ہم سب)

# عاصمہ۔۔۔انتہائی دلیر خاتون

واجد شمس الحسن

میں جب آخری بار عاصمہ جہانگیر سے لندن میں ملا تھا تو میں نے ان سے کہا کہ عاصمہ آپ ہمارا آخری سہارا ہیں، آپ کے بعد سیلاب آجائے گا۔ جب جرنیل یہ باتیں کررہے تھے کہ 70,000 زائد معصوم پاکستانیوں کے قاتلوں اور ان کے سروں سے فٹبال کھیلنے والوں کو مرکزی دھارے میں شامل کرلیا جائے تو عاصمہ جہانگیر کی موجودگی میں اس بات کی امید تھی کہ ہم یہ جنگ جیت سکتے ہیں۔ میرے جیسے زندگی کے آخری حصے میں پہنچنے والے لوگوں کو شاید ایسی امید کی ضرورت بھی تھی لیکن ان کی بے وقت موت سے یہ امید بھی ٹوٹ گئی حالانکہ اس وقت پاکستان کو بطور ملک اور معاشرہ ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ جب بینظیر بھٹو کو قتل کیا گیا تھا تو میں نے خود سے سوال کیا تھا کہ کیا ہمیں اپنے ملک کو تباہ کرنے کیلئے کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے؟ اب جبکہ قومی افق پر مذہبی انتہا پسندی ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے اور انتہا پسندوں نے قائد کے پاکستان کو دفن کرنے کی کوششیں تیز کردی ہیں تو کیا ہم اپنی بقاء کی اس جنگ میں عاصمہ جہانگیر جیسی انتہائی دلیر خاتون کو کھونے کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ عاصمہ جہانگیر کی موت پر وہ بھی افسردہ ہیں جو اچھائی اور برائی میں تمیز کرسکتے ہیں۔ جب کبھی بھی بے یارومددگار لوگوں کی چیخ وپکار سنائی دے گی تو یہ عاصمہ جہانگیر کی موت کا ماتم ہوگا۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے جن الفاظ میں عاصمہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے اس سے بہتر الفاظ ملنا مشکل ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے 'انسانی حقوق کے دیو' کی موت ہوگئی ہو۔ انہوں نے عاصمہ کی انصاف اور مساوات کیلئے جدوجہد کو بھی سراہا۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انٹونیو گوٹریس نے عاصمہ جہانگیر کی وفات پر افسردہ لوگوں سے تعزیت کا اظہار بھی کیا۔ ان کے الفاظ تھے کہ عاصمہ جہانگیر انسانی حقوق اور مساوات کی ان تھک داعی تھیں۔ انہوں نے ایک پاکستانی وکیل ہونے کے ناطے نظام انصاف کے اندر بھی اپنی خدمات انجام دیں اور عالمی سطح پر سول سوسائٹی کی رکن اور اقوام متحدہ کی نمائندہ خصوصی ہونے کے ناطے بھی اپنے فرائض بخوبی نبھائے۔ عاصمہ جہانگیر بہت شاندار، بااصول، باہمت اور مہربان خاتون تھیں۔ مجھے معلوم ہے کہ انہیں تاریکی کی قوتوں سے مسلسل دھمکیاں ملتی رہتی تھیں۔ انہیں کباب میں ہڈی سمجھا جاتا تھا۔ انہیں لگتا تھا کہ ایک دیوان کی مخالفت پر کمربستہ ہے۔ وہ لوگ اس بات سے پریشان تھے کہ یہ خاتون لاپتہ افراد کے لیے آواز کیوں اٹھا رہی ہے۔ ان کا بلوچستان کو غیر فوجی علاقہ بنانے، اس کے لوگوں کو جمہوری اور آئینی حقوق سے استفادہ کرنے کا مطالبہ بھی ایسی چیز تھا جس کی وجہ سے ان کی زندگی مسلسل خطرے میں رہتی تھی۔ ان کی زندگی پر مسلسل حملے ہوئے لیکن وہ ہر بار محفوظ رہیں۔ وہ شاید بینظیر بھٹو کے بعد دوسری لیڈر تھیں جو یہ سمجھتی تھیں کہ موت کا خطرہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو وہ اپنے اصولوں پر قائم رہیں گی۔ جب کبھی بھی میں انہیں وارننگ دیتا تھا تو وہ بینظیر کے الفاظ دوہرایا کرتی تھیں۔ وہ الفاظ یہ تھے ''اگر موت کو آنا ہے تو آجائے۔ اس سے ڈرنا چاہیے نہ اپنے ان مقاصد کو چھوڑنا چاہیے جس کیلئے انہوں نے ساری زندگی جدوجہد کی ہے''۔

میری ان سے پہلی ملاقات 1989 کے شروع میں ہوئی تھی۔ میں راولپنڈی میں وزیراعظم ہاؤس کے ایک ڈنر میں شریک تھا۔ وہاں آئی ایس آئی کے چیف لیفٹیننٹ جنرل حمید گل بھی میز پر ہمارے ساتھ موجود تھے۔ وہ بڑے جوشیلے تھے۔ مجھے عاصمہ کا تو علم نہیں لیکن میں پہلی مرتبہ ایک جرنیل کی باتیں سن رہا تھا۔ ہم اس وقت حیران رہ گئے جب انہوں نے بظاہر ایک ریاستی راز سے پردہ اٹھایا اور کہا کہ جلال آباد جلد ہی مجاہدین اور آئی ایس آئی کے مشترکہ آپریشن کے نتیجے میں قبضے میں آجائے گا۔ میں نے اور عاصمہ نے ان کے تفصیلی بیان کی مخالفت کی۔ اور ایک پنجابی کڑی کی طرح انہوں نے گل کو اپنے دل کی بات بھی کہہ دی جب گل نے کہا کہ ہماری سرحدیں دریائے آکسس تک بڑھ جائیں گی۔ انہوں نے پنجابی میں حمید گل سے کہا کہ جنرل صاحب ذرا سنبھل کر رہیے گا کہیں ہماری سرحدیں بڑھنے کی بجائے سکڑ نہ جائیں۔ بلاشبہ یہ ایک دلچسپ بحث

میری ان سے پہلی ملاقات 1989 کے شروع میں ہوئی تھی۔ میں راولپنڈی میں وزیراعظم ہاؤس کے ایک ڈنر میں شریک تھا۔ وہاں آئی ایس آئی کے چیف لیفٹیننٹ جنرل حمید گل بھی میز پر ہمارے ساتھ موجود تھے۔ وہ بڑے جوشیلے تھے۔ مجھے عاصمہ کا تو علم نہیں لیکن میں پہلی مرتبہ ایک جرنیل کی باتیں سن رہا تھا۔ ہم اس وقت حیران رہ گئے جب انہوں نے بظاہر ایک ریاستی راز سے پردہ اٹھایا اور کہا کہ جلال آباد جلد ہی مجاہدین اور آئی ایس آئی کے مشترکہ آپریشن کے نتیجے میں قبضے میں آجائے گا۔ میں نے اور عاصمہ نے ان کے تفصیلی بیان کی مخالفت کی۔ اور ایک پنجابی کڑی کی طرح انہوں نے گل کو اپنے دل کی بات بھی کہہ دی جب گل نے کہا کہ ہماری سرحدیں دریائے آکسس تک بڑھ جائیں گی۔ میں نے پنجابی میں حمید گل سے کہا کہ جنرل صاحب ذرا سنبھل کر رہیے گا کہیں ہماری سرحدیں

تھی اور میں دیکھ سکتا تھا کہ ان کے اندر ایک جوالامکھی موجود ہے جسے ٹھنڈا نہیں کیا جاسکتا اور جب بھی انہیں لگتا تھا کہ وہ حق پر ہیں تو وہ بھرپور طریقے سے آواز بلند کرتی تھیں۔ شاید ان کی وارننگ کا مطلب یہ تھا کہ آج آپ افغانستان کو اپنی تزویراتی گہرائی (Strategic Depth) سمجھتے ہیں کل شاید یہ معاملہ الٹ ہوجائے۔ بعد میں خطے میں جو کچھ ہوا اس نے عاصمہ جہانگیر کی وارننگ کو سچ ثابت کیا۔ جن مجاہدین کی حمید گل نے تربیت کی تھی اور انہیں مسلح کیا تھا انہوں نے الٹا اپنی بندوقیں ہم پر ہی تان لی ہیں۔ پاکستان ان کیلئے تزویراتی گہرائی بن گیا ہے اور امریکہ ان کے ٹھکانوں پر ڈرون حملوں کی دھمکی دے رہا ہے۔ عاصمہ جہانگیر ایک بہت ہی حساس شخصیت تھیں اور انہوں نے خطے کے ممالک میں غریبوں کی حالت زار دیکھی تھی۔ وہ امن اور تنازعات کے پرامن حل کی حامی تھیں۔ اکثر میں دیکھتا ہوں کہ لوگ ان کی پاکستان اور بھارت کو مذاکرات کی میز پر لانے کی کوششوں پر تنقید کرتے ہیں۔ انہوں نے جب بھی بھارت سے امن کی بات کی تو پاکستان کے مخصوص ایوانوں میں لوگ اس سے ناراض ہوئے جو تاریک ریاست کے تحت کام کررہے تھے۔ اور میڈیا میں بیٹھے ان کے زرخرید لوگ عاصمہ جہانگیر کو راء کی ایجنٹ قرار دیتے رہے۔ عاصمہ مانتی تھیں کہ ہتھیار، ہتھیار ہی ہوتا ہے اور وہ اصولوں کو ذاتی تعلقات پر قربان نہیں کرتی تھیں۔ وہ بینظیر کے بہت قریب تھیں اور بی بی بھی ان کی بہت عزت کرتی تھیں۔ آخری بار وہ برطانیہ میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے لیڈی مارگریٹ ہال میں آئی تھیں۔ وہاں انہوں نے 2018 کو بینظیر کی یادگار پر اپنی دوست بینظیر کو خراج تحسین پیش کیا۔ درحقیقت یہ انتہائی یادگار لمحہ تھا۔

(12فروری،2018)

(روزنامہ مشرق)

# روشن خیالی کی پسپائی اور حکمراں طبقے کا کردار

مسعود اشعر

عاصمہ جہانگیر کی وفات کے بعد سوچنے سمجھنے والے حلقے اب اس ہولناک صورتحال کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں روشن خیالی، رواداری اور وسیع النظری کی گنجائش محدود سے محدود تر ہوتی جارہی ہے۔ اور تنگ نظری اور انتہا پسندی ہمارے سیاسی، سماجی اور مذہبی ماحول پر قابض ہوتی جارہی ہے بلکہ ہماری نئی نسل کے روشن فکر مورخ ڈاکٹر طاہر کامران تو کہہ رہے ہیں کہ تنگ نظری اور شدت پسندی ہمارے ماحول پر قبضہ کرچکی ہے اور روشن خیالی پسپا ہوچکی ہے۔ انہوں نے کل ''نیوز آن سنڈے'' میں جو مضمون لکھا ہے وہ ہمارے لئے ایک تازیانہ ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ہماری تاریخ میں ایسے واقعات کا ایک طویل سلسلہ ہے جنہوں نے ہمیں ان حالات تک پہنچایا ہے۔ انہی واقعات میں لال مسجد کا واقعہ بھی ہے۔ یہ واقعہ یا سانحہ کیسے ہوا؟ اور اس میں اس وقت کی حکومت کے بااختیار افراد کا کیا کردار تھا؟ اسے ایک دیانت دار اور پختہ کار سرکاری افسر نے اپنی آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔ طارق محمود ہمارے معروف اور معتبر ناول نگار ہیں۔ سرکاری افسر کی حیثیت سے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ آج کل وہ اپنی یادداشتیں لکھ رہے ہیں۔ یہ یادداشتیں ملتان کے سہ ماہی رسالے ''پیلوں'' میں شائع ہو رہی ہیں۔ پیلوں کے تازہ شمارے میں ''کچھ میری زنبیل سے'' کے عنوان سے ان یادداشتوں کی جو قسط شائع ہوئی ہے وہ اسلام آباد کی لال مسجد اور اس کے خطیب مولانا عبدالعزیز کے بارے میں ہے۔ طارق محمود اس زمانے کا قصہ بیان کرتے ہیں جب وہ اسلام آباد میں سیکرٹری داخلہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آب پارہ اسلام آباد کے نواح میں جامع مسجد، لال مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس کے خطیب مولانا عبدالعزیز اپنی شعلہ بیانی کی وجہ سے خاصے مشہور ہیں۔ دین کے بارے میں ان کا نقطہ نظر بسا اوقات عملی صورت بھی اختیار کرلیتا ہے جب ان کے مدرسے میں علم کے فیض سے بہرہ ور طالب علم لاٹھیاں لے کر نکل آتے ہیں۔ وڈیو شاپس، مساج پارلران کا فوری ہدف ہیں۔ ان باتوں سے قطع نظر کچھ عرصے پہلے انہوں نے ایک فتویٰ جاری کردیا۔ وزیرستان اور طالبان کے خلاف جنگ میں شہادت پانے والے نوجوانوں اور افسران کی قربانی پر سوال اٹھا دیئے۔ موصوف نے کئی دیگر علمائے کرام کے ساتھ مل کر فتویٰ جاری کیا اور پھر اس کی خوب تشہیر ہوئی۔ لال مسجد کوئی نجی مسجد نہیں بلکہ محکمہ اوقاف کی مسجد ہے جس کا انتظامی کنٹرول اسلام آباد انتظامیہ کے ہاتھ میں ہے۔ مولانا دوسرے لفظوں میں محکمہ اوقاف کے ملازم ہیں۔ ڈسپلن کی خلاف ورزی پر ان کو نوٹس دیا جاتا ہے اور پھر ضابطے کی کارروائی کرنے کے بعد انہیں فارغ کردیا جاتا ہے۔ مولانا کے بارے میں اصلی فیصلہ سازوں کے ہاں ابہام پایا جاتا ہے۔ کبھی ان کے خلاف سخت اقدامات کی تلقین کی جاتی ہے اور کبھی انتظامیہ کو ہاتھ کھینچ لینے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ وفاقی کابینہ میں بھی ان کے حق میں بات کرنے والے موجود ہیں جو کڑے وقت میں ان کی حمایت میں اپنا وزن ڈالنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ غرضیکہ فیصلہ سازی کی تاریں کئی جگہ سے ہلتی ہیں۔ اسلام آباد پولیس نے ان کے بھائی مولانا غازی

عاصمہ جہانگیر کی وفات کے بعد سوچنے سمجھنے والے حلقے اب اس ہولناک صورتحال کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں روشن خیالی، رواداری اور وسیع النظری کی گنجائش محدود سے محدود تر ہوتی جارہی ہے۔

کے مدرسے پر چھاپا مارا، اور ایک بغیر لائسنس کے کلاشنکوف برآمد کرلی۔ کیس رجسٹرڈ ہوا تو وفاقی وزیر برائے مذہبی امور جناب اعجاز الحق کا فون آ گیا۔ وہ اس چھاپے سے ناخوش تھے۔ وزیر موصوف نے اپنی آواز بلند کی تو مجھے کہنا پڑا، ایسی اطلاع پر انتظامیہ آئندہ بھی ایسے چھاپے مارتی رہے گی۔ مناسب ہوگا کہ وہ مولانا صاحبان کو سمجھانے کی کوشش کریں، دوسری طرف سے فون بند کردیا گیا۔ مولانا کو ان کی ملازمت سے برطرف کیا جاچکا تھا۔ حکومت کے اہم منصب داروں میں جب بھی ہمدردی جاگتی موصوف کے لئے کلمہ حق ادا کرنے سے نہ چوکتے۔ سلسلے چلے تو ایک روز اشارہ ہوا کہ مولانا کو فوری طور پر ان کے منصب پر بحال کردیا جائے۔ اس بحالی کا فطری مطلب تھا کہ لال مسجد جہاں سے انہیں سرکاری طور پر فارغ کیا گیا تھا اسے دوبارہ ان کی عملداری میں دے دیا جائے۔ اس قضیے کے حل کے لئے کچھ ضابطے درکار تھے۔ ان کی برطرفی کے خلاف سیکرٹری داخلہ اپیلیٹ اتھارٹی تھا۔ مولانا کی اپیل لامحالہ میرے سامنے پیش ہوئی۔ میں نے متن کا جائزہ لیتے ہوئے تحریری طور پر مطلع کیا کہ مولانا پہلے اپنا فتویٰ واپس لیں، یا اس سے لاتعلقی کا اظہار کریں جو انہوں نے افواج پاکستان کے شہدا کے بارے میں جاری کیا تھا تو اس کے بعد ہی اپیل پر فیصلہ ممکن ہے۔ میرے نوٹس کے جواب میں مولانا نے ایک تحریر جمع کرادی، جس کا لب لباب کچھ یوں تھا کہ افواج پاکستان کے بارے میں ان کے دل میں بڑی قدر و منزلت ہے، اور وہ اس اہم ادارے کو بڑی تقدیس سے دیکھتے ہیں۔ جہاں تک فتوے کا تعلق ہے وہ ایک اجتماعی فتویٰ تھا۔ ان کا اس فتوے کی لاتعلقی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ فتوے کے مندرجات اپنی جگہ قائم رہیں گے جب تک تمام متعلقہ علما فتوے سے لاتعلقی کا اظہار نہ کردیں۔ دوسرے لفظوں میں مولانا اپنے دیرینہ موقف پر قائم تھے۔ مولانا کے خلاف اسلام آباد پولیس نے مقامی پولیس اسٹیشن میں بغاوت کے حوالے سے فوج داری دفعات کے تحت کئی کیس بھی کررکھے تھے۔ میں نے وزارت داخلہ اور ارباب اختیار کو باور کرایا کہ جب تک مولانا اپنے فتوے سے دستبردار نہیں ہوں گے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت سے ان کے خلاف فوج داری مقدمات واپس نہیں لئے جائیں گے، میرے لئے ان کی بحالی کے آرڈر جاری کرنا ناممکن ہے۔ میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ لیکن اس سارے قضیے میں کون ہار ماننے والا تھا۔ گھوڑے مہرے کئی طرف سے بھاگ رہے تھے، جمعہ کا دن تھا، مجھے وزیر مذہبی امور جناب اعجاز الحق کا فون آیا۔ کہنے لگے کہ مولانا عبدالعزیز نے فتوے سے لاتعلقی پر آمادگی ظاہر کردی ہے۔ وہ اپنی شعلہ بیانی کو بھی کنٹرول میں رکھیں گے۔ صدر مملکت سے بات ہوگئی ہے۔ آپ انہیں لال مسجد کی امامت کی باقاعدہ اجازت دے دیں۔ مجھے اپنے طور پر کسی ایسی صورت حال کا علم نہ تھا۔ میں نے ان کی بات کا جواب نہ دیا، صرف اتنا کہا کہ میں وزیر داخلہ اور مقامی انتظامیہ سے مشورہ کرکے کچھ بتا پاؤں گا۔ فون بند ہوا تو میرا ذہن ٹھٹکا۔ یہ بالا بالا کس منظر کا ساماں تھا۔ میں نے چیف کمشنر اسلام آباد کو فون کیا کہ جمعہ کی نماز کا وقت قریب ہے، وہ مسجد کی سیکورٹی کے بارے میں چوکس رہیں اور موجودہ صورتحال برقرار رکھنے کے لئے موثر اقدامات کریں۔ چیف کمشنر جنید اقبال میری بات سمجھ چکے تھے۔ کچھ دیر بعد جنید اقبال کا فون آیا، وہ کہنے لگے کہ مولانا عبدالعزیز تو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسجد پہنچ چکے ہیں اور اس وقت انہوں نے مسجد کی امامت بھی سنبھال لی ہے۔ ایسی گومگو کی کیفیت تین سال تک جاری رہی۔ میرے وزارت داخلہ سے تبادلے کے لگ بھگ دو سال بعد لال مسجد کا سانحہ ظہور پذیر ہوا۔ مولانا اور ان کے ساتھیوں کی شدت پسندی اپنی جگہ، بنیادی طور پر یہ سب ایک ناقص حکمت عملی کی وجہ سے تھا، جس میں طاقت کے بے جا اور اندھا دھند استعمال سے ملک بھر میں تشدد کی لہر کو جواز فراہم کیا گیا''۔ طارق محمود اپنی شرافت میں اسے ناقص حکمت عملی کہتے ہیں لیکن کیا ہمیشہ، اس معاملے میں ہمارے حکمران طبقوں کی یہی سوچی سمجھی حکمت عملی نہیں رہی ہے؟ آپ 70 سال کی تاریخ دیکھ لیجئے۔ دیکھ لیجئے کہ اس کے ڈانڈے کہاں کہاں ملتے ہیں۔

(20 فروری، 2018)

(روزنامہ جنگ)

# عاصمہ جہانگیر، کہاں سے لائیں تجھ سا کہیں جسے

عامر طارق

مارچ 2008ء میں بھارتی شہر احمد آباد میں قائم گاندھی آشرم میں بطور اقوام متحدہ کی ماہر خصوصی برائے مذہبی آزادی بن کر پہنچیں جسے بھارت میں مذہبی اقلیتوں کو حاصل آزادی اور حقوق انسانی کا جائزہ لینا تھا۔ جنوری 2013ء میں فلسطین کے مقبوضہ علاقوں میں یہودی آبادیوں کی تعمیرات کے فیکٹ فائنڈنگ مشن میں بھی عاصمہ جہانگیر نے حصہ لیا۔ غرض لاپتہ افراد کا کیس ہو یا 19 سال کے بعد رہائی پانے والی چنیوٹ کی رانی بی بی کی رہائی، اقلیتوں خصوصاً مسیحیوں کے خلاف جھوٹے الزامات اور مذہبی منافرت کے مقدمات کا معاملہ ہو یا پنجاب کے مظلوم کاشتکاروں اور سندھ کے ہاریوں کی اراضی کا معاملہ اور مظلوم ولاچار عورتوں کے خلاف ظلم کا مسئلہ، عاصمہ جہانگیر کی آواز ہمیشہ حق اور سچ کے لیے اٹھی، ملک کے پسماندہ اور محروم طبقے کی مسیحائی کے لیے بلند ہوئی۔

اپنی زندگی کا ہر لمحہ انسانی حقوق کی پاسداری اور بقاء کے لئے گزارنے والی عاصمہ جہانگیر ہم سے رخصت کیا ہوئیں کہ ایک دنیا غم واندوہ میں ڈوب گئی وہ ایک ایسی فکری سوچ کا نام تھا جو عمر بھر آمرانہ ذہنی رویے کے خلاف نہ ختم ہونے والی جدوجہد میں پوری قوت وجرات سے ڈٹی رہی۔ دنیا میں آج تک لاتعداد لوگ آئے اور اپنے وقت پر رخصت ہو گئے لیکن فکری اور انقلابی سوچ کے پیروکار شائد سینکڑوں یا اس سے بھی کم ہی ہوں گے۔ عاصمہ جہانگیر بھی انہیں گنے چنے انسانوں میں شامل تھیں۔ وہ ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت تھیں جو انسانی قدروں اور تقاضوں کو سب سے مقدم سمجھتی تھیں۔ ان کی ذہانت، دانش اور حکمت کا پیمانہ صرف انسانی خدمت سے ہی مشروط تھا۔ آج کے پاکستانی معاشرے میں رنگ ونسل، عقائد اور سیاسی وابستگی کی بنیاد پر تقسیم بہت خطرناک ہو رہی ہے اور نام نہاد ٹھیکیدار ذاتی عناد اور اختلاف رائے کی بنیاد پر کسی کو بھی کفر کا مرتکب قرار دے کر اس کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے لوگوں کی سوچ قابل مذمت ہے جو انسانوں کو انسانیت اور اقدار کے ترازو میں نہیں تولتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ عاصمہ جہانگیر نے اپنے انقلابی اور انسانی نظریات کی وجہ سے بار بار قید وصعوبت کی تکالیف برداشت کیں، پولیس گردی اور مقتدر اداروں کے غیظ وغضب کا سامنا بھی کیا اور صرف جمہوریت کی بقاء، آزاد عدلیہ اور انسانی حقوق کے لیے ان سے برسرپیکار رہیں۔ عاصمہ جہانگیر بطور سماجی کارکن انسانی حقوق کی پاسداری کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند تھیں اور وہ رنگ ونسل اور عقیدے سے بالاتر ہو کر ثابت قدمی اور بیباکی سے آواز حق بلند کرتی ہیں۔

جون 1999ء میں جنیوا میں اقوام متحدہ کی پریس کانفرنس ہو یا جولائی 1999 کا میکسیکو میں ماورائے عدالت اور سیاسی انتقام کی قتل وغارت کی تحقیقات کا معاملہ، مارچ 2002ء کی نیدرلینڈز میں پاکستانی اور دنیا بھر کی خواتین کے حقوق کے لیے تقریب کا موقع ہو یا اکتوبر 2002 میں افغانستان کے شہر میں واقع مہاجر کیمپ میں افغانی خواتین کی داردرسی، 2003 میں برازیل میں ماورائے عدالت ہلاکتوں کی تحقیقات کا معاملہ ہو یا ستمبر 2005ء میں فیصل آباد کی سونیا ناز سے پولیس اہلکاروں کی زیادتی کا معاملہ، اگست 2006ء کی اقوام متحدہ کے خصوصی مشن برائے ماورائے عدالت قتل کے رکن کی حیثیت سے ہونڈورس میں 820 بچوں کے قتل کی تحقیقات ہوں یا جولائی 2006ء میں لاہور میں لبنان کے خلاف اسرائیل مخالف مظاہرہ، وہ ہر جگہ ظلم وجبر کے خلاف سینہ سپر رہیں۔ اسی طرح وہ مارچ 2008ء میں بھارت کے زیر انتظام کشمیری دارالحکومت سری نگر میں حریت کانفرنس کے سینئر رہنما شبیر احمد شاہ کے ساتھ صحافیوں سے گفتگو میں شری ہوئیں جس کا مقصد مقبوضہ کشمیر میں ہونے والی انسانی حقوق کی مبینہ خلاف ورزیوں کی تحقیقات کرنا تھا۔ مارچ 2008ء میں بھارتی شہر احمد آباد میں قائم گاندھی آشرم میں بطور اقوام متحدہ کی ماہر خصوصی برائے مذہبی آزادی بن کر پہنچیں جسے بھارت میں مذہبی اقلیتوں کو حاصل آزادی اور حقوق انسانی کا جائزہ لینا تھا۔ جنوری 2013ء میں فلسطین کے مقبوضہ علاقوں میں یہودی آبادیوں کی تعمیرات کے فیکٹ فائنڈنگ مشن میں بھی عاصمہ جہانگیر نے حصہ لیا۔ غرض لاپتہ افراد کا کیس ہو یا 19 سال کے بعد رہائی پانے والی چنیوٹ کی رانی بی بی کی رہائی، اقلیتوں خصوصاً مسیحیوں کے خلاف جھوٹے الزامات اور مذہبی منافرت کے مقدمات کا معاملہ ہو یا پنجاب کے مظلوم کاشتکاروں اور سندھ کے ہاریوں کی اراضی کا معاملہ اور مظلوم ولاچار عورتوں کے خلاف ظلم کا مسئلہ، عاصمہ جہانگیر کی آواز ہمیشہ حق اور سچ کے لیے اٹھی، ملک کے پسماندہ اور محروم طبقے کی مسیحائی کے لیے بلند ہوئی۔ وہ پاکستان میں صحیح معنوں میں جمہوری وفلاحی سٹیٹ بنانے کے لیے کوشاں رہیں جہاں تمام انسانوں کو رنگ ونسل، زبان اور مذہبی عقائد کی بنا پر کسی تعصب یا منافرت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

آخر میں سوشل میڈیا پر برپا طوفان بدتمیزی کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جہاں محض نظریات اور عقائد کے اختلاف رائے کی وجہ سے چند افراد عاصمہ جہانگیر جیسی شخصیت کو تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ میری ان سے مودبانہ گزارش ہے کہ ہم سب بطور مسلمان اللہ تعالیٰ جو رب العالمین ہے، کی فیاضی اور بے نیازی کے طلبگار ہیں جو کسی کو بھی بشری تقاضوں کی وجہ سے سرزد ہونے والے گناہوں اور کوتاہیوں کے باوجود بھی معاف کر دیتا ہے۔ ہمارے پیارے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی ایک حدیث ہے۔ ''خیر الناس من ینفع الناس'' ترجمہ: لوگوں میں سب سے اچھا وہ ہے جو لوگوں کو نفع اور فائدہ پہنچائے''۔ ہم سب مذہب اسلام کے پیروکار ہیں جس کی تعلیمات کا ماخذ انسان کی خدمت اور فلاح میں مضمر ہے۔ دوسروں کو نفع پہنچانا اسلام کی روح اور ایمان کا تقاضا ہے۔ پاکستان میں کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ عاصمہ جہانگیر نے بطور قانون دان اور انسانی حقوق کی کارکن دکھی انسانیت اور مظلوم طبقہ کے حقوق کے لیے ہمیشہ آواز بلند کی۔ وہ شفقت اور محبت، غم خواری وغمگساری، ہمدردی، خیر وبھلائی، امداد وعانت اور خدمت خلق کے جذبات سے سرشار تھی۔ ان کی جدوجہد اور لڑائی صرف سامراجی اور غاصبانہ قوتوں سے تھی۔ حکمران چاہے ایوب خان، یحییٰ خان، جنرل ضیاء اور جنرل مشرف ہو یا جمہوری حکمران ذوالفقار بھٹو، بے نظیر بھٹو یا نواز شریف، ان کے دوٹوک سیاسی اور سماجی نقطہ نظر کی گونج سبھی حکمرانوں کے ایوانوں تک پہنچی۔ تاریخ شاہد ہے کہ کوئی طمع، حرص اور مفاد انہیں زیر نہ کر سکا۔ عاصمہ جہانگیر پسے ہوئے، بے سہارا اور ظلم وستم کے شکار لوگوں کے ساتھ کھڑی نظر آتی تھیں۔ وہ انسانیت کی علمبردار، پاکستان کے بے آواز لوگوں کی آواز اور ایک درخشاں ستارہ تھیں۔ بقول شاد عظیم آبادی:۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم
اے ہم نفو وہ خواب ہیں ہم

(21 فروری، 2018)

(روزنامہ مشرق)

*On how Benazir saw the state's role in blasphemy cases*

There was a case of a 14-year-old,along with two other Christian men, who had been charged with blasphemy. The case was picked up by the international and national media. [When the accused] were convicted by the trial court, I wondered why she [Benazir] was not doing anything about it, why she was silent. The next day, I was in court and the advocate general came to me and said, 'Come to my office. The Prime Minister wants to speak to you.' She was on the other end of the line. This was when I was quite upset with her. She asked, 'What is happening?' I said, 'You should know what's happening. Am I the Prime Minister or are you the Prime Minister?' She said, 'You have a very poor Prime Minister' and asked me if I was going to appeal. To tease her, I said I wasn't. … After a little silence, she said, 'Let me talk to the advocate general.' I said she didn't need to: I had already filed an appeal and the advocate general knew about it. And then the case went to appeal and they [the accused] were acquitted. Just before the acquittal, I received a message from someone to say that the Prime Minister had said it was the state's responsibility to protect them [the accused in the case]: let the state step in. [Later] I saw on television that one [of the accused] had been killed, but the second was sent to Germany by the government. I asked the attorney general what had happened. He said, 'As the Prime Minister said, it is the business of the state. So, let the state do this.'

*On Benazir as a politician and a realist*

She was not a conservative woman; she was a conventional woman. She believed that a certain number of conventions had to be kept. Marriage was important, aunts were important, uncles were important, keeping house was important and relationships were important. But I also realized that she was not a revolutionary because [she was] a negotiator. She was a very strategic politician. She was not idealistic in her actions, but she had an ideology that was optimistic and, to achieve it, she had to negotiate. It went against her sometimes because, when I would ask her, 'What happened?', her reply wasn't real and I knew she wasn't happy. But she had to survive.

I was chairperson of the Human Rights Commission of Pakistan at the time Benazir was Prime Minister. As the chair of HRCP, I had to point out human rights violations. She would always argue, 'Asma, I am not running an NGO, I am running a country.' And I would say, 'Yes, you may be running a country, but there should be some limits because living in society is a very complex thing [and you] need to handle the lines between government and society.'

She was extremely compassionate [even] when there were compelling circumstances.… I can never forget, for example, the time there were a lot of extrajudicial killings in Karachi. Another complaint had also come to the Prime Minister– of people extorting money. All the political parties decided that an HRCP team should go and [conduct]a fact-finding mission.… She said, 'We sent you to find out about extortions, but you've come back with a report saying there are extrajudicial killings.' And I said, 'That is there.' She was upset about the report, but she understood the facts.

*On working against bonded labor*

We were working with bonded labor in Sindh. A laborer and his family had been picked up by a landlord and we were finding it difficult to have them freed because once we had done so, the police would arrest them again. We had information that there was a very powerful person who was not letting them be released. We called the HRCP Hyderabad office… we got the facts and sent them to the Prime Minister. Her principal secretary called me and said the facts were very upsetting and asked what we wanted them [the government] to do. I said, 'Can you send a message to all the district commissioners of Sindh to support us against bonded labor? Within two years, 35,000 people were released. Yet Benazir never gets credit for this.

*On Pakistan*

Benazir was a 'security risk', according to our ISI general in Pakistan. Nawaz Sharif is a 'security risk', Faiz Ahmed Faiz was a 'security risk', Mujeebur Rehmanwas a 'security risk, Wali Khan was always a 'security risk'. … Does Pakistan exist for the people of Pakistan [or] does it exist only for the cantonments of Pakistan? I think that is what we have to decide.

# The last word

*On 5 February 2018, Asma Jahangir gave a lecture at Lady Margaret Hall, Oxford, titled 'Remembering Benazir Bhutto'. It was her last public address. Asma passed away six days later.*

*Here are some excerpts from the lecture.*

I think it is no coincidence that I am here to speak about Benazir Bhutto's life as I saw it – especially on this day because it had special significance for her. Benazir was very committed to the rights of the people who lived in Srinagar. And today is Kashmir Day, when people are protesting against the atrocities committed by the state against those living in Kashmir, particularly in Srinagar. And I think she felt so strongly about it because she herself had been a victim of bigoted politics.

*On her connection with Benazir Bhutto*

It was a strange connection. When Benazir's father, the late Zulfikar Ali Bhutto, became Prime Minister of Pakistan, the first person he arrested was my father. And when the death sentence was given to Zulfikar Ali Bhutto, my father was so agitated, he went from pillar to post to try and save him. And I thought, what is this kind of a friendship and how can he save somebody who had put him in prison? But *that* is what the political culture of Pakistan is. You stand up for your principles. You do not support or offend people simply because they have offended you at a certain point.

*On how Benazir helped change Pakistan's political culture*

She was never my leader – as a political leader – because I never joined her party… [But]I felt that she had changed the political culture of Pakistan. … She transformed herself and she also transformed the political culture of Pakistan. It became more tolerant: a culture [in which] people were not abusing each other, people were not arresting their opponents, people were not condoning extrajudicial killings, people were not justifying torture. But let me remind you … [that] Pakistan is a country where, if you represent the people and come to power with the support of the people, you are always a threat to the establishment. When you look like a threat to the establishment, it means you area 'threat' to Pakistan.

*On Benazir and the women's movement in Pakistan*

When she [Benazir] came to power, within a week she had banned public hangings. She released all women under trial who stood accused under the Zina Act and she released children. And *that* was the first message of a new political culture, a political turnaround in Pakistan. … There was only PTV at the time and women like me had been banned from speaking on PTV. That was the first time I was called by PTV to talk about women's rights. … And then, I got a message from Radio Pakistan [to say that] the Prime Minister wanted all women's rights activists to talk on the radio about women's rights in Pakistan. Every day, I and other women were on the radio, discussing women's rights.[It was] a silent revolution for women's rights.

# The legacy Asma leaves behind

*Peter Jacob*

Asma Jahangir breathed her last in her battlefield whilst discussing legal issues over the telephone with a member of the legal fraternity. Predictably, she will live on as a symbol of resistance to oppressive practices and her model of activism will be a subject of inquiry. In that event, the traditions and standards she set as a human-rights defender and a human being, will continue to inspire theoreticians and practitioners alike.

She contextualised the rules of engagement in social action that were tried upon in other parts of the world during human rights movements. The moral principles and strategies she adopted drew clear distinction between dos and don'ts that may guide social actors in discharge of their responsibilities, irrespective of the ideological peculiarities.

Firstly, she managed to engage in dialogue with people in power, directly and indirectly, without sacrificing her responsibility as an activist. For instance, her role in drafting the Bonded Labour (Abolition) Act of 1992 and as member of the official Commission of Inquiry on Status of Women in 1997 is a testimony to engaging with the government on reasonable terms. Nevertheless, she did not aspire for a political office and refused to accept financial assistance from the government in order to maintain an institutional impartiality. Hence, she was able to remain political neutral while contributing to crucial struggle for democratic development.

Similarly, political neutrality was a hallmark in the human-rights institutions she helped build. For instance, the Human Rights Commission of Pakistan adhered to standards of impartiality from appointments and organisational structure to offices to human rights reporting. Her colleagues and successors also upheld the tradition.

Secondly, the magnanimity shown in providing legal and moral support to her detractors in need is reminiscent of a high degree of optimism and faith in human virtue. The moral worth made her argument more convincing against her adversaries.

Thirdly, Asma maintained a balance or a combination of idealism and realism. While she pursued idealism in protection of human rights, she was highly mindful of pragmatic needs in advocacy. For instance, her strategy and logistics for visit to Balochistan in 2006 exemplified a combination of down-to-earth approach and idealism of conscientious objection.

Fourthly, professionalism, she is the only person who held the three positions as the UN special rapporteur for about 20 years. This explains that a wide range of international bodies recognised her expertise in different areas of protection of human rights besides her integrity and credibility. The appointments on these jobs are made through wide consultative and participatory process and no remuneration is paid.

She visited several countries for fact-finding missions as the UN special rapporteur, her credibility as impartial and independent human rights expert was such that not a single country ever challenged her report, even though the reports were critical of governments' action or inaction. Being part of observers' mission to Guantanamo Bay jail was no small feat, particularly as a Pakistani.

Fifthly, she used her hard-earned personal repute to advance her activism, however, never sought any favours in home country owing to her position in the UN, etc. Hence her stand on human rights accompanied a display of character, something that leadership of all levels can benefit from.

Sixthly, she maintained a resolute confidence in people-centric approach, hence she invested her energies in organising and educating a cadre of human rights defenders, build institutions that could cater to needs in mobilising and campaigning for human rights. No surprise that she made herself accessible to a wide range of media simultaneously with people across the country who approached her for litigation, mostly without fee.

Finally, besides a thinking mind, she nurtured a feeling heart. She was a better advocate because she could listen to and step into shoes of the victims of grave human rights violations. Her legacy is testimonial that the Pakistani society can produce individuals of acumen, character and egalitarian ideals.

*The Express Tribune*
26 February 2018

institutions like the school I attended and the Women's Action Forum (WAF) led by Jahangir herself. They are all wearing yellow dupattas with empowerment slogans scribbled on them. Together, they had stared down dictators and taught us all the importance of democracy and human rights when there were none. Here and now, decades later, they seem humbled and truly ready to pass the baton.

We all gather as the cot carrying her body is being brought forward. And what an assembly it is! I see Pashtuns in their red caps — her swansong audience — standing next to celebrities who have all enthralled the public over the years, women in burkas and women sporting cropped hair, smartly dressed lawyers, and non-conforming activists, mighty politicians, and incapacitated common folk. I see Christian nuns joining in, and later would spot a turbaned Sikh waiting for public transport outside the gate. There is some pushing and shoving, but all in love: everybody wants a piece of their hero.

They announce that the last rites will be performed by Syed Haider Farooq Maududi, a man whose surname divides rather than unites, whose father's teachings in part birthed tendencies in society which Jahangir dedicated her life to eradicating. Farooq's dissimilarities with the senior Maududi are all well publicised, but none could symbolise those more than his act today.

The men seem to have taken their places, but the women are still marching ahead with Jahangir. Where are they going? I stand on my toes and try to catch a glimpse of the moving body. Barely over five feet tall, her corpse, draped in white cloth, seems so fragile and thin. I marvel that a woman who took only this much space utterly engulfed the minds of gun-toting dictators in fear, banished cruel perpetrators away from their victims, and affected our national discourse for decades.

But then I hear her roaring voice, now only radiant in the atmosphere around us, vibrant and resounding in its message of justice, loud in its rationality and as clear as the blue skies today, and she doesn't seem so tiny after all.

Adjusting to these heaving shuffles, men are asked to make room for the opposite sex at the front. Of course, this is Jahangir's funeral. In death, as in life, she has no time for quaint mores and primeval edicts. When they gave her lined paper, she had written the other way. It is at once understood that women will stand shoulder to shoulder with men in bidding her a religious farewell. Nobody dares counter this. Nobody could.

And then, her prayer ushers in two minutes of silence. As Maududi blesses her soul with peace, I surrender myself to a divine epiphany. That this right here is a consummation of what Asma Jahangir strived for all her life: fruition. That women stood anchored next to men, that Pashtuns fashioned their red caps with pride, that the Baloch were welcome in another province, that the Sunni prayed with the Shia, that the disabled were cared for by the powerful, that the minorities were accommodated within majority ranks, that the liberals grieved together with the conservatives.

For these momentous two minutes, at this juncture in history, everything has coalesced into unison — Maududi, WAF, men, women, red caps, yellow dupattas, lefties, right-wingers, Pakistanis, foreigners, Muslims, the others — that we have, for this hard-fought yet fleeting blip in time, realised a federal, egalitarian, representative, pluralistic and peaceful Pakistan. Jahangir has won, but we have lost Jahangir.

Her cot is loaded back into the ambulance for her final journey and people start filling up the streets on all sides, leading to various circular exits. Without a shepherd, everybody is moving in a different direction, back to the caves of their prejudices, biases, sects and miseries, distancing themselves further and further away from the open centre that just bound us.

As I trace my steps back towards the archway, I notice the flag of Pakistan atop the stadium again. Still fluttering in the wind, perhaps a little less high, less boisterous, for a giant is passing beneath its shadow.

*The News on Sunday*
18 February 2018

It's only right that I'm walking on foot towards the venue. This tactile connection with land and its people — dirt, warts and all — is what Jahangir championed and never lost. And it's also where she built her legend: Jahangir the street fighter, fighting General Zia's oppressive laws on the Mall Road in 1983, covering it end-to-end again in 2007, rallying lawyers against Musharraf's increasing tyranny whilst getting baton-charged. But today is marked by silence.

A team of young cricketers are holding a practice session as I amble by one of the manicured grounds, their collective noise never amounting to more than a flick of the bat. Birds and crows glide smoothly over us all, their chirp the only signal of time crawling by. I see a policeman in deep sleep in one of the vans, cap on his face, his life perhaps still embroiled in the poverty Asma helped alleviate for others. The sound-bite of her name comes from walkie-talkies near and far, but I hear nothing else after that.

The stadium eventually comes into full prominence, the flag of Pakistan fluttering high and proud. I come across a banner put up by the Chief Minister's office paying lip-service respects to their one-time nemesis, emblazoned with a picture of her sitting on a motorbike behind a woman during a women's marathon that was held a couple of years ago.

Known to be "brave enough to get angry," her bright, lambent smile with her fist in the air is not what is usually associated with her public image. I sense myself choking up. What if somebody sees me? What will they think? I had not known her personally, had briefly seen her in flesh only once, and did not belong to the legal fraternity or the many disenfranchised groups she serviced selflessly all her life. I was not even of the same gender or generation as hers, but why did it feel like the floodgates of some visceral grief were about to burst open?

I try to navigate my sense of self as I tread past the final check post, and into the wide space outside the stadium where we now await her.

As with the neighbourhood earlier in the afternoon, I reach ahead of time. The place is largely empty and the few people I see are all men. Oh right, I think to myself, this is a funeral after all. Will the women even participate? Workers run abound setting up chairs and a huge panaflex sheet with her face on it. "All of the world salutes you," it captions, perhaps incorrectly in grammar but never in meaning. Her image here is one we are much more familiar with, embodying stern conviction and striking grit. I take a seat and let the enormity of this occasion sink in.

Slowly but surely, mourners start pouring in. Black coats who worked alongside her, professionals who teamed up with her, students who learned from her. Seats are filling up, though none of the famous names are here yet. Neither are the women. "A huge void," a lawyer seated next to me tells his friend.

"It was so sudden," he replies, shaking his head.

"I'm here at madam's funeral," another man speaks into his phone.

Silence yet pervades. I'm jolted out of my thoughts by a large group of people emerging in the far distance. I know the convoy has arrived. Hundreds of nameless, faceless workers representing the myriad organisations who sought her out, now as orphans forever in her debt for making their lives a little less entrapped, carrying huge bouquets for their saviour, chanting slogans. Behind them is the ambulance carrying Asma Jahangir, surrounded by scores of women, mostly shrouded in black, returning their champion sister back to the people. Of course, that's where the women were, had been. Who else could Jahangir arrive with? And soon enough, there are as many women as there are men in this harmonious melting pot. It is unprecedented.

Some of them are told by the organisers that there is a separate enclosure for females on the right side behind a tent. They refuse. Of course, this is Jahangir's funeral. They take up front row seats next to media cameras where they'll bring her body.

Another activist with scorched skin wearing beaded, colourful jewellery surprises her friends, blood-like tears in her red eyes, declaring, "I've come from Islamabad in solidarity."

I spot my old school principal talking to other familiar women, a fiery and famous band of lifelong girlfriends, mostly elite urban Lahoris now all in their late sixties, who founded progressive

# Goodbye, warrior!

*Raaid Masood*

Everything coalesced into unison — Maududi, WAF, men, women, red caps, yellow dupattas, lefties, right-wingers, Pakistanis, foreigners, Muslims, the others. Here's a consummation of what Asma Jahangir strived for, all her life.

I make a pit stop at the local bookstore. I have reached this neighbourhood unexpectedly ahead of time and so I decide to wait it out amongst books.

Three vans — full of school children are on their short study trip to the store as well and are seen running excitedly in the aisles. I try to find a solitary spot as I always do in a place of more than 10 people, not to any success. One teacher trying to break off a mischievous tussle between two rowdy boys passes me an awkward smile. I tell her I once went to the same school.

An hour later I'm still there. Two highly acclaimed and popular journalists enter the premises and know exactly which books to buy and where they would be placed. They engage in friendly banter over how much money they owe each other and leave as quickly as they came. I sit in the corner observing them, thinking to myself maybe I'll get to see them later in the day again.

The driver picks me up as scheduled and I ask him to take me to Gaddafi Stadium. The road opposite the Liberty Roundabout leading to the stadium is blocked by barricades and I see a multitude of police cars and media trucks parked next to them. We drive close to a policeman and I inquire whether there is a possibility I can continue further towards the stadium. "No", he says politely but firmly, "Asma Jahangir has died!"

Maybe he thought I had some other business going inside. I tell him I need to attend her funeral, and he asks me to simply walk.

I willingly undertake this long trek, interrupted by a number of makeshift check posts. The policeman manning the first one asks me where my car is and soon lets me proceed. He and his peers ahead are all uncharacteristically respectful and friendly today. Without traffic, I traverse a smaller roundabout and the road leading to the venue with ease.

The February wind still carries a chill, set against a bright sun shining down on us. The city had officially welcomed spring last week, and the weather was getting warmer. But it had rained the day Asma died, a universal outpouring of mourn, as the skies wept unabated in the lead up to her funeral. The cool and gentle breeze accompanies me as I enter the tall, squared archway marking the premise of the stadium.

There's stillness all around, one I desperately searched for in the wake of her passing. I had been away on a weekend getaway trip with cousins when my sister gave me the news. I immediately disputed its veracity, bringing into question the credibility of our friend who posted the message. But despite my quick repudiations, somewhere deep inside it stung me. What if it's really true?

I quietly checked for myself and confirmed her demise. I must have frozen, but none of my cousins — some much younger than me — seemed fazed by it. Why doesn't their revelry break? Is the world not supposed to stop and shudder when a giant passes? Why were they still discussing their next meal and not expressing the fear of how difficult national life will be without her? I need to get back home, I had kept thinking to myself, irritated.

she also worked as a Special Rapporteur of the United Nations Commission on Extrajudicial, Arbitrary or Summary Executions, a job, which took her to Afghanistan, Central America and Colombia. In recent years, she was UN's special rapporteur for Iran and her straight-talk angered the hardliners in Iran as well.

But it was home where she dazzled. In 2010, she was elected as the first ever woman president of the Supreme Court Bar Association. This was a time when she was also a fierce critic of the Chief Justice Iftikhar Chaudhry. Jahangir supported Chaudhry when Gen Musharraf wrongfully fired him in 2007 but once the judge regained his position, Jahangir was back to business of checking abuse of power. As the bar leader, Jahangir brought some sanity amid hyper-activism of the Supreme Court during 2010-2011.

Yet, her credibility at home was always challenged by fundamentalists and the all-powerful establishment. Her opponents in the Mullah-Military combine left no stone unturned to defame her. She was declared a Western agent and, in recent years, an Indian stooge. The reason was obvious: Jahangir stood for peace with India and vociferously articulated an alternative vision for Pakistan which was secular, democratic and based on regional cooperation.

Her consistent stance on principles of human rights and democracy unnerved every ruler in the country. During Musharraf's time, she was a fierce critic of his regime and he even named her several times in a disparaging manner. In 2005, she was abused and manhandled during a mixed gender marathon which had been organised to raise awareness about violence against women. Little wonder then that after Musharraf launched his second coup in the guise of an emergency in 2007, Jahangir was placed under house arrest.

Unlike many in Pakistan's fractured civil society, Jahangir shunned public offices. Benazir Bhutto, in her two stints as Prime Minister, wanted Asma Jahangir to become a judge of the superior courts but Jahangir refused.

In 2013, Nawaz Sharif was elected as the prime minister for the third time. From the very start, it was evident that Sharif's relationship with the establishment would be rocky to say the least. And it turned out to be just the same. A long drawn civil-military conflict culminated in the judicial ouster of Sharif. Throughout his tenure, Jahangir supported the primacy of civilian institutions and after Sharif's controversial dismissal by the court, she was the staunchest of voices against the judicial excess. The opposition leader Imran Khan and his party distorted her position as political support for Sharif. Jahangir called out Khan for his soft stance on Islamic extremism and his bidding of the military establishment to destabilise Sharif. Jahangir's detractors, therefore, multiplied as Khan's young supporters saw her as the foe. In addition to being anti-Pakistan, an Indian agent, enemy of Islam, she was also painted as an apologist for 'corrupt' Sharif dynasty.

Jahangir fought back and with her usual gusto. Never deterred by personal attacks she was unmoved. Her positions on all matters, political and legal, remained unchanged. This was her real strength and confidence in principles she had remained loyal to.

This larger-than-life commitment to her passion and gritty hard work came at a cost. Her health suffered. Leading a highly stressful life — waging multiple battles at the same time — perhaps ended in that fateful cardiac arrest last Sunday. For many of us, it will be a black Sunday for we are yet to determine all that has been lost with the passing away of an exceptional individual.

Even in her death, Jahangir overthrew conventions and her public funeral was attended by women who are generally not allowed to pray with men. The right-wing has created a furor with fatwas flowing in. A nasty campaign on TV and social media continues defamation. But these desperate attempts are likely to fail in dwindling her legacy of resistance and hope.

Rest in power, Asma Jahangir. You showed us what a meaningful life entails.

*Daily Times*
18 February 2018

# Asma Jahangir is no more – but her formidable legacy lives on

*Raza Rumi*

It will take some time to accept that Asma Jahangir has gone silent. That she is not at the centre of Pakistan's political discourse. As a formidable and relentless fighter, Asma Jahangir personified the struggles Pakistanis have waged against executive excesses, shameful cultural practices and discriminatory legislation throughout the country's history. Jahangir kept the torch of public liberty, freedom and democracy alive for decades. Since her foray into activism as a young woman, Asma Jahangir remained a fearless champion of democratic rights and, in many ways, the conscience of Pakistan during the last forty years.

A leading Pakistani lawyer, Jahangir was most renowned for her role as a human rights activist. This was a role which resulted in her confronting the military dictatorships of General Zia-ul-Haq and General Pervez Musharraf, as well as civilian autocrats. In 1972, when Asma Jahangir was a teenager, she filed her first petition to have her father — who had been arrested for denouncing war crimes in Bangladesh — released from prison. She won the case. In fact, the earliest and the only judgment against a military coup is attributed to her name. Her resistance to the Pakistan army's active role in politics was legendary. In 1999, when sections of Pakistan's civil society welcomed the apparently secular Musharraf, hers was the only clear, unequivocal voice against military intervention. A decade later when Pakistan rallied behind judges and lawyers to oust Musharraf, Jahangir was once again at the forefront.

In 1987, Asma Jahangir and her sister Hina Jilani partnered with other women lawyers formed the first law firm established by women in Pakistan, named the AGHS Legal Aid Cell. To date, AGHS has provided legal services to several women and members of minority groups, and it continues to be a benchmark against which the legal profession and public law in Pakistan will be judged in the annals of Pakistani history.

During Ziaul Haq's dictatorship, Asma was also at the vanguard of activists who created the Women's Action Forum (WAF). Jahangir, along with other women activists, led protests against enforcement of fundamentalist laws, specifically the Law on Evidence (which made a woman's testimony inferior to that of men), together with demonstrating against the conviction of a 13-year-old blind rape victim for *zina* (adultery). WAF was the first spark of resistance against military rule and inspired men and women of all faiths, ethnicities and backgrounds to rally against a repressive dictatorship. Her struggles continued thereafter even when civilian governments were ruling Pakistan. She was as outspoken as before and refused to adopt a partisan line. Within years, Jahangir received global acclaim and became a symbol of progressive and liberal-democratic elements within Pakistan. She was recognised and honoured across the globe for her stellar contributions to human rights and advocacy for marginalised segments of Pakistani society.

Another key contribution by Jahangir was the establishment and nurturing of the formidable Human Rights Commission of Pakistan (HRCP). Today, it is the biggest and most credible network of rights' activists in Pakistan with a presence in all corners of the country. Jahangir remained the Co-Chairperson of the HRCP for several years. She was also one of the founders of the South Asia Forum for Human Rights.

Even though Jahangir will always be remembered for her work in Pakistan, her influence had turned global in the past two decades. The United Nations appointed her as a Special Rapporteur of Freedom of Religion of the United Nations Commission on Human Rights. From 1998-2004,

removed or if chemo would be needed. She dealt with the pain and uncertainty stoically. I didn't hear her complain once.

The intense recovery period morphed slowly into a more regular pace of life, as Asma healed.

One evening, when she had regained some strength, I walked into the apartment and saw her sitting in the living room with TJ. She looked a little tired, speaking more softly than she usually did. We decided to have dinner together and ordered food from Chicago's Devon Street, famous for its desi restaurants. We talked politics and as the evening progressed, she gained more energy. As she ridiculed Pakistan's politics and its corrupt system with choice Urdu and Punjabi phrases, I discovered Asma was a wonderful mimic, extremely witty, and she giggled at times like a happy schoolgirl. The doctor also called that evening to give us the fantastic news: there was no need for chemo. Asma said, "We should celebrate. Let's plan an outing." Abbe came up with several options and an ebullient Asma decided on a night of jazz music. We would celebrate her recovery at The Green Mill, one of Chicago's best and oldest jazz venues.

When the day arrived, I entered Asma's apartment and saw her standing near the kitchen counter making tea, wearing a colorful shalwar kameez.

"Kaisey ho baita?" she said, using the same words as when I'd picked her up at the airport. In the weeks since, I discovered she was indeed a rockstar, just even more courageous, resilient, and humorous than I had imagined. And our time together had flown by. She was leaving the next day for Lahore.

"I'm good, Asma Khala," I replied. As we hugged, I felt a tinge of sadness at her impending departure. Still, we had the whole evening before us, for which I was excited. "Where is Uncle TJ?"

"He is getting ready," she said, "Where is Abbe?"

"She's getting ready too."

"Good. We have some time to chat. Would you like some tea?"

I realised, even then, how special this moment was, when I got a chance to chat with her one-on-one. First, she asked me about my work and our life in Chicago, and listened intently, asking questions. She was visibly pleased that I was doing well. Then, I asked her: what was she looking forward to when she got back to Pakistan? It was a simple question, asked casually, unthinkingly.

As she spoke, it dawned on me that my simple question had been asked to someone who had just battled cancer and got a new lease on life. The clarity of her vision, her purpose, was evident in her every word and gesture. She explained how she felt she had gotten a bit sidetracked with all kinds of conferences, special positions and honorary stuff like PhDs from universities. She wasn't going to waste any more time on such things.

"Now, when I go back," she said, fervidly, "I want to really focus on what I'm most passionate about. It's what started me down this road. To help the women of Pakistan."

She explained all the things she wanted to do, and in the way her eyes narrowed and sparkled, in turn pained, hopeful, dismayed and ultimately defiant, I saw not a woman in her sixties, but someone much younger: a 30-something idealistic lawyer, who had marched down the streets of Lahore, facing teargas, batons and imprisonment. The person I had heard of as a seven-year-old boy and wanted to know, had appeared.

Our teacups empty, Asma, TJ, Abbe and I all walked out together from the apartment and stepped into a balmy Chicago evening. Strolling down the leafy streets, we chatted and laughed, Asma and TJ walking in a pair, ahead of us. Fifteen minutes later, we were at The Green Mill. And the jazz club didn't disappoint. At one point in the evening, as the piano and trombone grew to a fevered pitch, pI turned and looked at Asma. She was gazing up at the musicians on stage, smiling and shaking her head to the beat of the music. She noticed me looking at her, and gave me a quick smile – no longer my unfamiliar khala.

*The Friday Times*
23 February 2018

A few days earlier, my mother had called me from Toronto in distress. Asma had been diagnosed with cancer. She was coming to Chicago for treatment from a leading cancer specialist. “Please email her and let her know that you’ll be there to pick her up at the airport,” mother said. “And that you’ll be at her disposal for the duration of her stay. I’ve already told her that you are.”

Waiting for Asma to arrive, I recalled my earliest memory of her. The year was 1983. I was seven years old and at home when the phone rang, followed by an anxious discussion between my parents about what was happening in the city that day. Asma and members of her Women’s Action Forum (WAF) had taken to the streets protesting the discriminatory laws that Zia, Pakistan’s military dictator, had instituted against women. The police had tear-gassed and charged the protestors with batons to break up the rally. A heavy silence hung in the room as I learnt that Asma had been injured and was now behind bars. I remember thinking, “Who is this crazy and daring woman? I want to know her.”

Our paths did cross, every time she’d come to meet my mother. But I was too young to engage with her in a meaningful way. I moved abroad as an adult, and during my wedding in Lahore fifteen years later, I was deeply touched when Asma and TJ hosted my American mother-in-law and several friends as guests in their home. But somehow we never got a chance to connect one-on-one then, either, given the madness of the wedding.

As I stood at the airport, nervous, thinking about Asma’s cancer diagnosis, it didn’t feel like a wish coming true to see her now due to this troubling circumstance. Yet my wish would be answered – just not in the way I expected, and not for another couple of weeks.

When Asma emerged, she had a calm energy about her, and greeted me with a hug. “Kaisey ho baita?” she said. “How are you, son?” These words, and her natural warmth, put me instantly at ease. Her husband, TJ uncle, was with her. As we drove into the city together, the trees were still bare, the skies grey; spring was still a few weeks away. Asma paid no attention. Her focus was on her treatment and the logistics of her stay. She discussed treatment options, medical tests, appointment dates and times. Relatives and friends called her cell phone. She asked them not to worry, to please not show up in Chicago, and that everything was under control. It was going to be fine. She was like a general getting ready for battle. There was no fear or anxiety, at least none that showed. I briefly mentioned some sightseeing and entertainment options, but she was not interested. I dropped her and TJ off at their friend’s house, where they planned to stay until they found a hotel.

As Abbe and I helped search for a hotel room for them, preferably close to our condo, we had an amazing stroke of luck. Airbnb showed a listing that looked oddly familiar… in fact, it was directly below us, in our very same building! Upon inquiring, we learned that our downstairs neighbour was headed off to travel in Europe for several months. We locked in the rental for his one-bedroom apartment, and Asma and TJ moved in.

Over the course of three weeks, Asma and TJ became our real-life neighbors. Abbe and I dropped in to see them, before and after work, to say hello and help with any small tasks. When Abbe baked, she dropped off cinnamon rolls, brownies and other treats for the Jahangirs. We made arrangements for our maid to help clean their apartment too. Like two Lahori Aunties, Asma and I occasionally griped about certain details of her work but also expressed our deep appreciation. Uncle TJ and I worked together to master the new apartment’s cable TV and air-conditioning system. We loved our new neighbours.

Looking back, the three weeks that we spent with them had three distinct flavours. The first was pre-surgery, with Asma and TJ settling into the new apartment and getting ready for the surgery. This period, starting from Asma’s arrival in Chicago and ending with her surgery, was practical and efficient, although not without its moments of humour. One evening, laughing and a little chagrined, Asma told us, how she was stunned at discovering a stash of sex toys and S&M paraphernalia in one of the cupboards of her apartment, belonging, presumably, to our neighbour from whom we had rented the apartment. I felt a pang of guilt and embarrassment, since we had found the apartment for her. But seeing Asma laugh heartily put my mind at ease.

After the surgery, Asma’s apartment lay mostly silent and dark. After an anxiety-filled wait of 6+ hours of surgery, it would take several more days to learn if the cancer was completely

An investigative report on this matter was published in a newspaper on Friday. It's mind boggling revelations, irrespective of suspicions that have circulated for some years, provide an insight into how our entire structure of governance and the judicial process have thoroughly been corrupted.

It may seem odd that I have brought together an investigative report about the criminal behaviour of our police officials with an assessment of the potential for a progressive agenda. In the first place, I am searching for some clarifications about the direction of our present state of societal disorder.

On the face of it, Rao Anwar does not at all belong in any analysis of the challenges that the civil society confronts after Asma's death. But the contents of such media reports should be taken into account when we think about the injustices and oppression that exist in our society. Furthermore, extrajudicial murders were very much at the heart of Asma's campaign.

It isn't possible to give a gist of what the investigative report has unmasked. I can only give you a hint about the magnitude of the transgressions that were committed with impunity. We are introduced to Rao Anwar as "an instrument of the deep state". We are told that "even the Sindh chief minister was helpless before a policeman who knew he was more powerful than even the province's chief executive".

What we have here is a thriller that has its place in the realm of fiction. But the truth of it is spine-chilling. Since the Supreme Court is also involved in the Rao Anwar affair, we should expect that some form of action will be taken at some level. But that would certainly not change the fundamental character of a system that is shaking to its core.

It is a situation that is beyond the comprehension of the religious extremists and the obscurantists. In a sense, the ruling ideas are under pressure and can be pushed into retreat if the progressive forces of change are able to unite and move forward. In times like this, all institutions become divided and there is confusion about what is to be done. The point is that there must be people in all segments of our society who crave freedom and justice. The real task is to mobilise the enlightened elements to protect and promote democratic values.

The battle, it would appear, has begun. But I am also aware of the fear that after Asma, a void will begin to emerge. We will surely miss her. But we also need to be motivated by her example and, as the poet said, "find strength in what is left behind".

*The News*
18 February 2018

***

## My rock star khala

*Taimur Ali Ahmed*

One afternoon, in May of 2015, my wife and I stood anxiously at Chicago's O'Hare airport, waiting for Asma Jahangir – the world-renowned human rights lawyer and activist, a household name in Pakistan and champion of women's and minorities' rights – to emerge from Arrivals. Outside, my freshly detailed car was waiting to take her into the city. I turned and noticed Abbe, my wife, biting her nails. I too was nervous, like I was going to meet a rock star, someone I had idolised all my life. She was one of my mother's oldest friends but for a variety of reasons, we'd never really gotten to know each other. I referred to her as Asma Khala – Asma Auntie – but really she was unfamiliar and unlike any aunt I'd known. But things were even more complicated than that.

# Civil society after Asma

*Ghazi Salahuddin*

Throughout this week, our minds have been concentrated on Asma Jahangir. Those of us who passionately endorse the universal values of democracy and social justice are still in a state of shock.

It is, perhaps, the present state and mood of the nation that has enhanced our sense of bereavement. At the same time, we have an occasion to celebrate the amazing life of a great human being. Since Asma had touched so many lives in different spheres, we have an outpouring of memories and specific personal encounters. We were stunned by the news of her death that spread in the afternoon last Sunday. It struck us from out of nowhere.

Some of us were at the Karachi Literature Festival that had entered its final phase. It helped because we could condole with each other. I. A. Rehman was there and we were able to gather around him. The KLF provided an appropriate backdrop to share our initial feelings about what had happened. Then, we could sense the surge of anguish and sorrow across the country and beyond.

Asma's detractors must have been astonished that her death had prompted such a groundswell of sympathy and an affirmation of her struggle for the rights of the oppressed and for rule of law. They, the detractors, are a powerful lot. But are there any signs that the balance of power is beginning to shift?

This, in fact, is uppermost in my mind as I make an attempt to understand the life and legacy of Asma Jahangir. That I had known her for many long years, mainly through the activities of the Human Rights Commission of Pakistan, is beside the point. Yes, personal reminiscences do intervene.

I had travelled to Lahore from Karachi for her funeral on Tuesday with Zohra Yusuf, a former chairperson of the HRCP who was very close to Asma. The memories we shared during this journey are a veritable treasure. Set in a pattern, they could draw a glowing portrait.

However, we have already had a number of tributes and appraisals of Asma's life and work, underlying her indomitable courage and commitment as a defender of human rights. Eventually, we have to think about what it is going to be like after Asma's death.

One measure of this concern was her funeral. The presence of women in that unique congregation was in itself a vindication of Asma's iconoclastic mode of protest. More than that, it was a microcosm of modern Pakistan, with its manifestations of plurality and tolerance. In that sense, it inspired hope that the shock of Asma's death may bring various strands together and create the prospect of a new alliance of liberal and progressive forces.

As I have suggested, this coming together of the civil society should have some relevance to the existing social and political situation. Nawaz Sharif's confrontation with the establishment and the higher judiciary is truly consequential and has raised some vital issues about the drift of the present democratic disposition. Meanwhile, the quality of political discourse has greatly worsened. The general mood is that conspiracies are forever being hatched.

In the midst of all this turmoil, there is this spectacle of how a powerful police officer linked with extrajudicial killings for all these years has now gone missing. What is important is that this was the result of the massive protest launched after the murder of a Pakhtun young man. It is this protest that has signalled a change of some kind in the political environment.

Anyone who doesn't subscribe to the narrow notion of national security and nationalism can be branded 'unpatriotic' by the so-called defenders of our ideological boundaries.

Indeed, Asma relentlessly fought against every military regime and struggled for democracy and civilian supremacy. That certainly did not please the so-called patriotic elements. Her campaign against forced disappearances and her criticism of security agencies' role have also been used to question her patriotism. Nothing could be more ridiculous than that.

In fact, her struggle gave hope to the alienated people of Balochistan of getting justice and civil liberties. On her death, Akhtar Mengal, a former chief minister of Balochistan, tweeted: "Balochistan is forever in your debt." The remarks also represented the sentiments of the Baloch population towards her for raising a voice for their rights at the national level. She became a symbol of the national unity that our so-called patriots and nationalist chauvinists have never been able to fathom.

And it was not just Balochistan; Asma was there to support any struggle for democratic and civil rights. Her last speech was at the Pakhtun long march in Islamabad. Organised by a group of Pakhtun students and young activists, the protests triggered by the killing of Naqeebullah Mehsud in a staged police encounter in Karachi last month became a forum for the demonstration of grievances of the population affected by the conflict in the tribal areas.

Hundreds of people are known to have become victims of enforced disappearances. Such a policy cannot help win the hearts and minds of the people who have suffered massive destruction and displacement from their homes. Those assembled in Islamabad were not militants; they were victims of war in their areas. They were not sure whether the state has really changed its policy of 'good Taliban/bad Taliban'.

That concern is witnessed in many other parts. Asma shared their concerns and anger over indiscriminate action against the Pakhtuns in other parts of the country. Like many other progressive public figures, Asma had been a strong critic of the disastrous state policy of using militancy as a tool of foreign policy that cost Pakistan massively, both in terms of human lives and the economy.

Asma's campaign for normalisation of relations with India had also become a major issue for the nationalist brigade. They also used this to question her patriotism. An old newspaper picture of her with India's extremist Hindu leader Bal Thackeray resurfaced on social media, though she had met him in her capacity as the United Nations special rapporteur on freedom of religion investigating violence against Muslims in India. What these zealots have forgotten is that Asma also raised her voice against Indian atrocities in occupied Kashmir.

She had long been targeted by the extremist Islamist groups for her unrelenting campaign for women rights and the misuse of the blasphemy laws. This is also being used against her in the latest social media campaign. She was never intimidated by the extremist onslaught despite the serious threat to her life. She never left the country; that demonstrates her courage and fearlessness.

As she said in an interview that whatever she did she never deviated from her core principles; she never sought glory or ever tried to benefit from adversity. Her courage has certainly been recognised by the people here and by the international community, notwithstanding the vitriol spewed by the forces of regression that are not willing to let go of their obscurantist worldview. These are the same people who glorify murder in the name of faith. The way Mashal Khan's murderers were lionised is a horrific manifestation of the rising religious extremism against which Asma stood up.

These are the same elements that have been running a concerted campaign against Malala, another international icon of courage. The young Nobel Prize winner has been accused of being a Western agent. They don't want to see how these two brave women raised Pakistan's image. As one American writer has pointed out, Pakistanis often complain about the bad image of their country being projected in the international media, but they refuse to see what they are doing to those who present the dynamic face of their country. These are the people who are afraid of Asma's legacy.

*Dawn*
14 February 2018

students and teachers at the LSE how to fight injustice related to religious intolerance, using democratic means (a subject that seems to become more and more important across the world). Her ideas were buzzing around the LSE for many weeks.

Activist lawyers, especially those who lead human rights movements, are often in danger of violent attack by people whose despotism and oppression are threatened. In Shakespeare's 'Henry the Sixth, Part Two', when Jack Cade with recently acquired – indeed ill-acquired – power talks about his policy priorities, one of his followers, Dick the Butcher, says, "The first thing we do let's kill all the lawyers" (4, 2, 1, 78).

Asma had to face many such Dick the Butchers in her committed and dedicated life. But my fearless friend continued to speak, argue, plead, guide, and lead the movements she had founded and built, without being at all deterred. Threats and dangers could not stop her. Nor could they reduce the force of her reasoning. Nor diminish her extraordinary warmth and humanity which captivated all.

Even though Asma has left us, we can still not only bask in her glory, but also continue to be guided by what she has taught us. The angel of humanity may have gone, but the great inspiration and the penetrating education we have got from her are here to stay. At this tragic moment, there is comfort in that thought – and we can have pride in having known so perfect a human being.

Address at Harvard Kennedy School, Cambridge, MA
17 February 2018

***

## Who's afraid of Asma Jahangir?

*Zahid Hussain*

THOUGH small in stature, Asma Jahangir stood tall against the usurpers and bigots who were her biggest nemesis. They were scared of her. Her relentless fight for justice and for the rights of the people made those in power uneasy. Her fearlessness made them shudder. Her quest for regional peace earned her the wrath of the warmongers.

She was the conscience of a nation that has produced few icons whom the people can look towards for inspiration. In her death the country may have lost its bravest soul and a fearless street fighter, but her legacy lives on. The principles Asma stood for and the causes she championed are very much alive.

Therefore, it is not surprising that while her passing is being mourned across the region and religious divide, there are also some who have not spared her even in death. The kind of filth spewed against her in the social media reflects a sickening mindset of powerful interest groups who were challenged by Asma. They ran a concerted campaign against her when she was alive, but this campaign has become even more vicious after her death. They are afraid of the legacy of struggle she has left behind. She was among the few Pakistanis who also won international acclaim for her struggle for human rights.

Asma's courage has been recognised here and abroad, notwithstanding the vitriol spewed by regressive forces.

Indeed, religion and patriotism are two major weapons in their arsenal that they use in their venomous propaganda campaign against her. There is certainly nothing new about this. They know they can't attack her for her struggle for democracy and justice. Hence these issues come in handy. The adage that 'patriotism is the last refuge of the scoundrel' fits well in this case.

There is no mystery about who is spearheading this social media campaign. What is, however, more disconcerting is how young minds are being polluted in the name of nationalism and patriotism by some elements. Among them are also members of mainstream political parties.

# Asma Jahangir, my fearless friend

*Amartya Sen*

It is hard to find a measure of Asma Jahangir's greatness. She was a brilliant intellectual, a superb humanist, a great political leader, an epitome of kindness, a personification of indomitable courage.

Asma was all these things – and much more. Professionally she excelled as a magnificent lawyer, who did more than anyone else I can think of to defend and save helpless people from the unjust wrath of authoritarians and tyrants. As one of the most distinguished human rights lawyers in the world, Asma used her legal knowledge to protect the vulnerable and unimaginably strengthen people's rights.

As it happens, Asma Jahangir's first legal victory came before she became a trained lawyer. She won a great legal victory in freeing her father, Malik Ghulam Jilani, a parliamentarian and critic of the military who had been unjustly incarcerated by the government. At the time of her victory at the Supreme Court (in a case celebrated as 'Miss Asma Jilani vs the Government of Punjab'), Asma was barely twenty years old. Later, with professional legal training and far-reaching vision, combined with her exceptional intelligence, Asma became the leading defender of human rights in Pakistan, in the company of other great human rights activists like I A Rehman and Dorab Patel.

It is extraordinary to see how much the Pakistan Human Rights Commission has achieved in the cause of justice, without even having the firm legal – and constitutional – status that, say, the Indian or the South African Human Rights Commission can comfortably rely on (those commissions have a much easier job than the Pakistan Human Rights Commission, which – despite that legal handicap – has achieved no less, particularly through powerfully mobilising public opinion and involvement).

I personally think that in understanding Asma's success, it is important not only to appreciate the strength of her skilled arguments, her trained reasoning and her deep-rooted courage, but also the tremendous warmth of her personality including her radiating friendliness. She generated enthusiasm across the world, but particularly on the two sides of the sub-continental divide. Asma was loved in Pakistan, but no less in India, and whenever she gave a talk in India, the room – whatever its size – was always overfull. She communicated an amazing closeness that was felt by all. It was her companionable personality, in addition of course to the force of her reasoning, which helped her to bring judges, even in most difficult cases, to see her arguments with sympathetic clarity. It is amazing how Asma won case after case against what seemed like insurmountable adversity.

I have been extraordinarily privileged to have Asma as a close friend for nearly two decades. I first met her when we were both members of a joint Indo-Pakistani initiative to engage the citizens of the two countries to talk more with each other (Asma was the co-chair of the group, along with former prime minister I K Gujral on the Indian side).

I was awestruck by the clarity of Asma's mind as well as her boundless humanity and warmth. We had the chance to talk a great many times in many different places when we met (as we did frequently), but we had the most wonderful opportunity to talk endlessly when she and her wonderful husband, Tahir Jahangir, stayed with us at the Master's Lodge of Trinity College in Cambridge. We were often joined by her younger daughter Sulema, also a lawyer. I learned a huge amount from Asma about how to think about one's priorities and duties in the most complex of circumstances.

One of the most fulfilling moments of my life came last year when Asma spoke at the London School of Economics, in a lecture named after me – I have not done anything to deserve it (I hasten to add) but the LSE has such an annual series. Asma explained to nearly a thousand

for what she wore. Quite a few things did not change, though. Smoking, for instance. Doctors' warnings persuaded her to switch over to lighter brands. For some time, *bidi* was the thing. Then back to thin cigarettes.

Also gossip sessions with friends were not given up. The core group comprised friends since childhood – Seema Iftikhar and Naazish Attaullah, followed by Mona Kasuri and Salima Hashmi. The common factor among them was that all of them, including Asma herself, had themselves made their lives and each one of them had excelled in the area of their choice. Asma would often relate with pride the hard struggles they had to wage before achieving success. She adored her friends and she also admired them.

Her love of having regular meals did not change either. Lunch was usually out of office and she did not care what she ate. But dinners were always elaborate affairs. She liked to cook for guests and especially for her children in foreign lands. She had a special liking for fish and would buy it from a choice shop in Islamabad and Karachi, to be carried home for the family, the bad smell making fellow travellers uncomfortable sometimes. During drives in the interior, especially in Sindh, she would like to stop at the first tikka shop by the roadside. She ate little but enjoyed a fresh tikka to cleanse her palate.

She was a good mother to her children. A good governess helped while the children were small. She gave them full freedom to become whatever they wanted to be and her husband, Tahir Jahangir, played his role quietly. They gave the children opportunities for studying in the best institutions of Canada and the US. If any one of them had a health problem Asma would take the child to any part of the globe where treatment was possible.

Asma loved crowds. Active crowds, and crowds that kept moving forward – *Jaloos*. She would issue the call whenever the crowd grew to a sizeable number.

We were having a workshop in Mirpurkhas with an unusually large number of correspondents and field workers from all parts of Sindh, around 650 of them. The Commissioner had imposed section 144 but that didn't deter Asma. She asked me about taking out a procession. My view was that a procession could be carried out if the people who had come to listen to the speeches exceeded 3,000. By afternoon the crowd had swelled to more than 3,000 and Asma's wish could not be denied. With Iqbal Haider jumping up and down in the frontline, the procession marched along the town's roads. The administration struck back by picking up senior activist Akhtar Baloch. But Asma made so much noise that he had to be released after 'first aid' treatment only.

Beginning with 2010 when she became the first woman president of the Supreme Court Bar Association she led a more hectic life than even a far stronger body could bear. The long line of litigants at her office grew longer. Even the General who had wanted to slap her wished her to defend her. Constant travelling between Lahore and Islamabad, with frequent breaks for flying visits to London, Geneva, Toronto and New York City, catching bits of sleep in cars and on planes, making notes, checking e-mails in short journey breaks, she took too much liberty with her body. She was a sound manager of time but there is a limit to which hours and minutes could be stretched.

Several times I called on her to slow down, because I saw a thin screen of pain on her face, which many thought was a sign of annoyance. Her remark always was, "I am OK". She literally worked herself to death.

There were quite a few things she left undone. But any mortal will be proud of what she had done. A little lawyer from Lahopre had become the greatest defender of human rights in the subcontinent and one of the bravest voices in the world against injustice, falsehood, autocracy, patriarchy, intolerance and humbug.

What a life, my friend Asma, and what a life to celebrate for a long, long time.

*The News on Sunday*
18 February 2018

a year away. With Justice Dorab Patel as its head and a governing body full of eminent fighters for basic rights, Asma as Secretary General launched HRCP on a full-throttle drive to defend the people's human rights.

The commission had its office in Asma's law chamber above a shop on Hall Road. For three years it received no donor support and all office-bearers themselves bore their expenses on attending its meetings. The commission started getting financial support in 1990 and it shifted to a flat that Asma had bought for herself in Gulberg.

1998 was a remarkably successful year in Asma's life. This was the year that Asma gave a dazzling display of her lobbying skills. We were in the midst of a regional human rights conference when we received reports that the National Assembly had passed a bill for the enforcement of the religious code, similar to Ziaul Haq's 9th amendment that had been passed by the National Assembly but had lapsed due to the Junejo government's failure to table it in the Senate. Within a few hours Asma persuaded the leaders of all opposition parties to block the measure in the Senate. The last one to fall in line was Akbar Bugti. He was asleep and woke up at midnight and immediately nodded concurrence. The bill was never sent to the Senate. It lapsed.

One other example of Asma Jahangir turning her sole voice into the voice of the majority was the demand for increase in women's seats in legislatures. A large convention was organised jointly by HRCP and Sustainable Development Policy Institute to discuss the quantum of women's seats in assemblies. Most organisations present were thinking of 10-12 per cent seats for women. Asma said: "Nothing less than 33 per cent."

A long debate ensued. She was supported by Tahira Mazhar Ali Khan, the then HRCP vice-chair for Punjab, and Aziz Siddiqui, and one or two others. By and by, Asma's supporters grew and by the end of the convention women's demand for seats in legislatures had been fixed at 33 per cent.

Beginning in the 1990s, Asma won an embarrassingly large number of international awards, including the King Baudouin Prize for development, which they wished to give to Asma alone but she put HRCP as a co-awardee and gave all the prize money, a substantial amount, to HRCP. She took these awards in her stride and valued only a few, such as the Right to Living Award, said to be an alternative to the Nobel Prize. Four foreign universities gave her honorary doctorates – two Canadian, one Swiss and one American – though she never used the prefix 'Dr'. She especially valued her title of Senior Supreme Court Advocate. There was an unmistakable glint in her eyes when she told me about this. The little girl who had dared to defend Safia Bibi had arrived among the highest category of the country's lawyers. She had found a place of distinction among her peers.

The most important thing that happened in 1998 was her nomination as the United Nations (UN) Special Rapporteur on extrajudicial, summary or arbitrary executions. She decided to consult Aziz Siddiqui and me about whether she should accept the job. She talked about her practice, her work at AGHS Legal Aid Cell, her duties to HRCP. Apparently she wanted us to endorse her entry into the UN system and perhaps an assurance from us that HRCP's work would not suffer. We duly helped her accept the UN offer.

With her work against extra-legal killings Asma took off into the international orbit. Important world leaders – presidents, prime ministers, academics, artists – sought her company and some advice too. She grew up fast. She acquired a deeper understanding of men and matters. She quickly learned to comprehend the problems related to extra-legal killings in various countries and also mastered the art of writing concise reports. She outpaced most of the people who at one stage or another considered themselves as her mentors.

The first UN mandate was renewed after three years and continued till 2004. This was in accordance with the normal practice. A bit unusual was the fact that without any break she was given a second mandate – on Freedom of Religion and Belief – that continued till 2010. This mandate enabled Asma to further refine her thought process and her advocacy skills. She also became more circumspect. The way she carried herself in public changed and she began to care

# My friend Asma

*I. A. Rehman*

I cannot recall exactly when and how I first met Asma. Did I see her when I was invited to dinner by her father, Malik Ghulam Jilani, to meet Nawab Akbar Bugti, who was staying with him? Not sure. But in the early 1980s I have several images of her in my mind. In one image, she is standing between me and Aitzaz Ahsan, whose protégé she at that time was supposed to be, by the bedside of Mahmud Ali Kasuri. Mian Kasuri sahib was unwell and wanted to discuss with his young friends how to strengthen the Lahore High Court Bar Association's challenge to the Zia tyranny.

However, I was soon attracted by Asma's campaign against the Hudood Ordinances and her defence of its victims, especially the visually impaired Safia Bibi, who had been sentenced to imprisonment and flogging for committing *zina*. She established herself, in my estimation, as a doughty fighter worthy of our respect. This impression was deepened when she was accused of having provided justification for the addition of the blasphemy provision to the Penal Code. I was among the many defenders of civil liberties who rallied to her defence.

This was a period of great ferment in Lahore's political circles. The Movement for the Restoration of Democracy (MRD, a name coined by top journalist Nisar Osmani) had been founded in 1981. Ziaul Haq had used the hijacking of a PIA plane to fill the jails with PPP leaders and a large number of leftists, and to proclaim the first Provisional Constitutional Order (PCO). He had also embroiled Pakistan in the Afghan conflict. At the same time the world had started looking at Zia's arbitrary curtailment of the legal protection to citizens. All these developments influenced Asma's mind and she decided to broaden her concerns and address human rights.

A distinct image in my mind is that Asma is standing in the door of my small room at Mazhar Ali Khan's brave weekly *Viewpoint* and I am scribbling something. She says: "Rehman *sahib*, let us set up a Human Rights Commission". And I say without lifting my head "All right, let us do that". For many years she would repeat this scene to chide me for my casual response to her momentous announcement and to remind me that I had been wasting my time writing in small letters something of little value.

Of course, she had been talking to a lot of people, especially after she had established the Malik Ghulam Jilani Foundation to continue her father's work following his sudden death. The Foundation held a convention in Lahore. It was at this gathering that the decision to set up the Human Rights Commission of Pakistan (HRCP) was taken.

The convention had the stamp of Asma's organisational capacity. Everybody who was doing something for women's rights, for political prisoners' release and welfare, or for the liberation of bonded labour was invited (Asma had already played a key role in the case of Darshan Masih in which the Supreme Court started the train of events that led to the abolition of bonded labour).

A distinguished guest had brought some posters and other display material to expose the excesses committed by the Bhutto regime. Asma put her foot down. She refused to allow the convention to be marred by unnecessary controversies. The honourable guest was free to walk out.

HRCP was founded in October 1986 and it came at the right time. Martial Law had been withdrawn, Muhammad Khan Junejo had become prime minister after a party-less poll. Benazir Bhutto had returned. MRD had conducted a movement three years earlier and another was only

References and candle vigils for the indomitable Asma Jahangir

Human Rights Commission of Pakistan

جہدحق

Monthly **JEHD-E-HAQ**

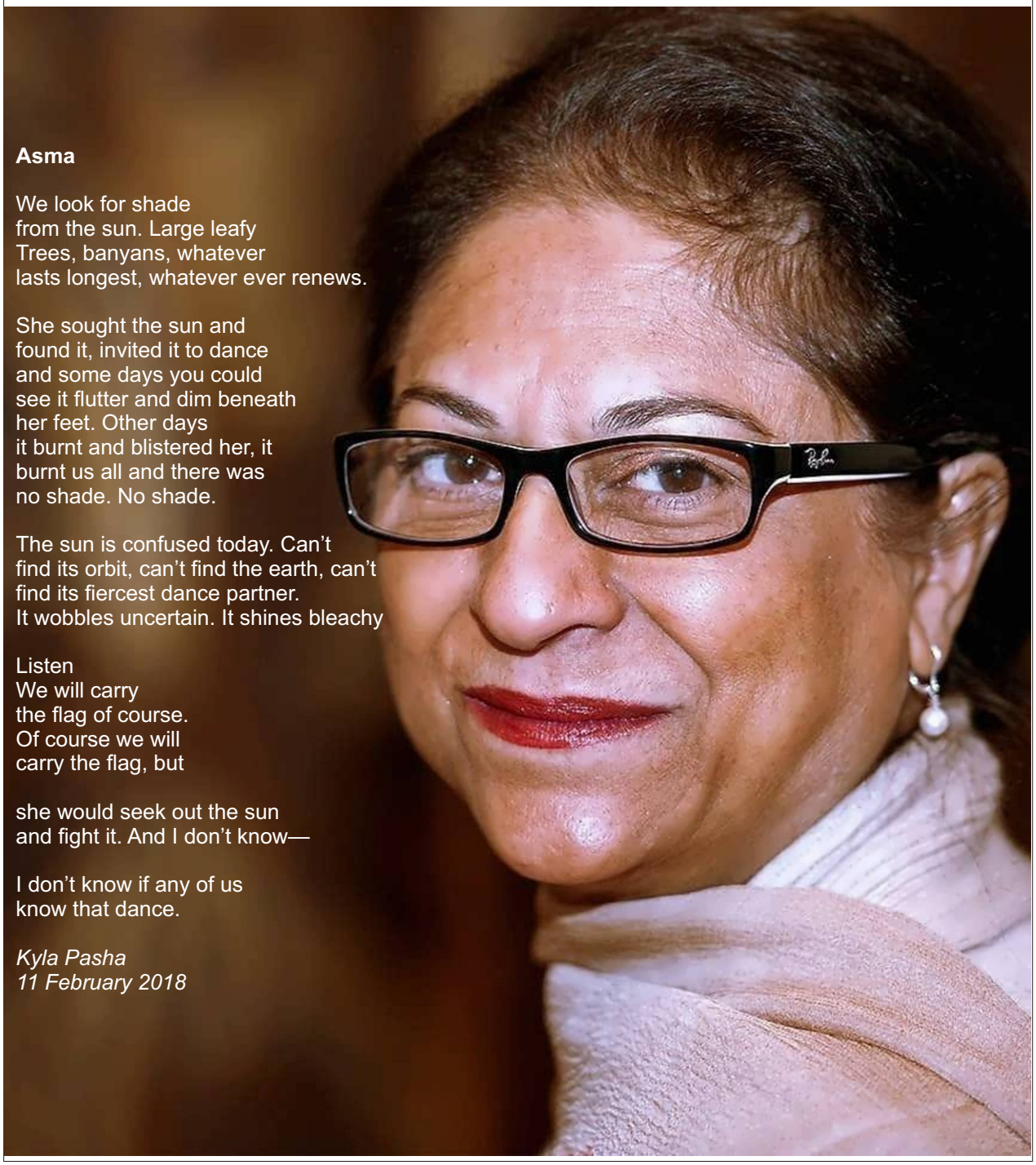



**Asma**

We look for shade
from the sun. Large leafy
Trees, banyans, whatever
lasts longest, whatever ever renews.

She sought the sun and
found it, invited it to dance
and some days you could
see it flutter and dim beneath
her feet. Other days
it burnt and blistered her, it
burnt us all and there was
no shade. No shade.

The sun is confused today. Can't
find its orbit, can't find the earth, can't
find its fiercest dance partner.
It wobbles uncertain. It shines bleachy

Listen
We will carry
the flag of course.
Of course we will
carry the flag, but

she would seek out the sun
and fight it. And I don't know—

I don't know if any of us
know that dance.

*Kyla Pasha*
*11 February 2018*

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
"ایوان جمہور" 107۔ ٹیپو بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور
فون: 35838341-35864994 فیکس: 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ: www.hrcp-web.org
پرنٹر: مکتبہ جدیدپریس، 14ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15